جلد ۱۱۱ اگست ۱۹۸۹ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۱ | اگست ۱۹۸۹ء مطابق محرم الحرام ۱۴۱۰ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: اِدارہ ترجمان القرآن، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

کیا قافلہ جاتا ہے!

اِس مرتبہ متعدد قیمتی رفیق اور خادمانِ دین آگے پیچھے ہم سے جُدا ہو گئے ۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ! ــــــ گویا ایک قافلہ جا رہا ہے ۔

سب سے پہلی غم انگیز اطلاع محمد یحییٰ صاحب کے انتقال کی ملی ۔ موصوف نے حسن خلوص اور سرگرمی عمل سے تحریک کی خدمت کی ، وہ ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ آخرت ہے ۔ ابتدائی صفوں کے لوگوں میں سے تھے ۔ میں اور وہ آگے پیچھے دنوں ہی ۱۹۴۳ء میں دارالاسلام پہنچے ۔ وہ ضلع مین پوری (بھارت) میں زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ تادیر مرکز میں وہ ہمارے ساتھی رہے ، پھر مختلف جگہوں پر مختلف کاموں میں حصہ لیا ۔ آخر میں بھائی پھیرو میں دعوت، خدمت خلق اور سیاسی کشمکش کی ذمہ داریوں میں مصروف رہے ۔ حج پر گئے تھے اور مکہ مکرمہ میں بلاوا آگیا ۔ اس طرح مبارک موت نصیب ہوئی ۔ ہزار ہزار مغفرتیں !

اِدھر ملتان میں جماعت کے ایک محب و حامی پروفیسر ریاض جولیہ کے رہنے والے تھے ، ظلم کی گولی کا نشانہ بن گئے ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں ان کی رُوح پر نازل کرے ۔ ان کے ساتھ ہی ملتان کے موجودہ امیر جماعت محسن شاہین صاحب جو اسلام پورہ نیالہ خورد سے تعلق رکھتے تھے ، اور اسلامی جمعیت طلبہ بہاولپور کے ناظم اعلیٰ رہ چکے تھے ، کئی گولیاں پیٹ میں لگنے سے شدید زخمی ہو گئے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ان کی حالت ہسپتال میں سنبھل گئی ہے ۔ (مزید دعائے صحت)

پھر ہمارے ایک نہایت ہی محترم اور محبت رفیق جو دیر سے ساتھ چلے آرہے تھے ، یعنی گھلن چک کے چوہدری عبدالغنی صاحب ، طویل زمانۂ علالت میں صاحب فراش رہ کر اپنے ربّ کی بارگاہِ ابدیت میں حاضر ہو گئے ۔ پُر سوز دل کے

(باقی بر صفحہ ۵۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(فنڈامنٹل ازم پر ایک گفتگو)

(۲)

ثالثاً: بائیبل میں احکام عشر (TEN COMMONDMENTS) کے علاوہ کوئی "حدود اللہ" ہیں ہی نہیں۔ بلکہ روزمرہ کا کام چلانے کے لیے فقہ کے تفصیلی اور جزئی اوامر و نواہی صریح طور پر مفسر اور واعظ پادریوں کے اپنی طرف سے شامل کردہ ہیں۔ ان کا انداز بیان اور ان کی استدلالی سطح اور ان کی عقلی قدر و قیمت یہ شہادت نہیں دیتی کہ وہ خدا یا اس کے رسولوں کی باتیں ہیں۔ ان میں تو اخلاقی روح حد درجہ کمزور ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص مذہب دار طبقے کی سرپرستی اور شکم پُری کا پروگرام ہے۔ نیز ان میں اتنی وقتی اور رسمی سطحیت ہے کہ وہ دور ہائے مابعد کے لیے انسانی تہذیب کا ضابطہ نہیں بن سکتے۔

جب کہ قرآن میں نہ کسی مذہبی طبقے کی تشکیل کی گئی ہے اور نہ اس کے احکام و حدود عقلی اور سماجی اور اخلاقی لحاظ سے بائیبل کے احکام و حدود کی طرح پست ہیں کہ ان کو انسانوں سے منسوب کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

رابعاً: عیسائیت کے پاس نہ ایسے جامع معتقدات اور اساسی افکار ہیں اور نہ نظامِ زندگی کے نہایت بدیہی اور روشن اصول ہیں، نہ ہر شعبے کے لیے اصولیات کا کوئی مکمل ڈھانچہ موجود ہے۔

اسلام کو کیسے آپ اس سطح پر لے جا سکتے ہیں، اس کے عقیدے روشن، ایمانیات بدیہی، اصول قاطع اور ہر شعبۂ زندگی کے لیے ہدایات واضح ہیں۔
عیسائیت تو خود عقلی طور پر اتنی کمزور ہے کہ عقلی علوم اس کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں۔ وہ عقلی علوم کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کر کے نہیں چل سکتی۔
لیکن اسلام ایسی کمزوری نہیں رکھتا۔

خامساً: اسلام میں مظاہر فطرت سے توحید اور رحمتِ خداوندی اور نظم اور قانون کے بارے میں استدلال کرتے ہوئے، جو باتیں کہی گئی ہیں وہ جدید سائنس کے بہت سے انکشافات سے اتنی ہم آہنگ ہیں کہ بڑے بڑے سائنس دان حیران ہیں کہ کئی سو سال پہلے قرآن کی دی ہوئی معلومات اور حال کی دریافتوں میں اتنی مطابقت کیوں ہے۔ بعض بلند فہم افراد نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے اور اس پر ایمان لانے والے بھی ہیں۔
خصوصاً سائنس، قرآن اور بائبل ایک مشہور کتاب سامنے آچکی ہے جس میں سائنس سے بائبل کے تصادم اور سائنس کے ساتھ قرآن کی ہم آہنگی کا اثبات کیا گیا ہے۔
پس اس لحاظ سے بھی فنڈامنٹلزم کے اطلاق کی حدود عیسائیت پر ختم ہو جاتی ہیں۔ اسلام اس سے آگے واقع ہے۔

اِن چند اشارات کو سامنے رکھیں تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ عیسائی پادری جن چیزوں کو فنڈامنٹل کہہ کر سائنسی اور فلسفیانہ علوم سے معرکہ آرا ہوتے تھے۔ اسلام میں ایسی کمزور چیزیں فنڈامنٹل ہیں ہی نہیں۔ لیکن اسلام کے پاس جو فنڈامنٹلز ہیں وہ اس کی حقیقی اور واضح اساسیات ہیں۔ خدا اور رسولؐ، کتاب اور سنّت، دنیا اور آخرت، عبادات و معاملات، دینی اوامر و نواہی، حلال و حرام، حدود اللہ، قانونِ شریعت، نصوص اور اجتہاد۔
ہمارا تو سارا سرمایۂ دین ہی فنڈامنٹل ہے۔ اگر ہم فنڈامنٹلز کو چھوڑ دیں تو باقی کچھ رہتا ہی نہیں۔ مسلمان لازمی طور پر فنڈامنٹلسٹ ہوتا ہے، مگر آپ کے ۱۹۲۲ والے

عیسائی پادریوں کا فنڈا منٹلزازم اور ہے اور ہمارا اور۔ ہمارے بنیادی عقیدے اور اُصول من جانب اللہ ہیں اور نہایت درجہ عقلی ہیں اور باقی سارا دین اُن پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں تو مسلمان ہونے کے لیے لازم ہے کہ آدمی اسلام کے لیے فنڈا منٹلسٹ بنے پھر آپ ۱۹۲۲ء کے امریکی پادریوں کے لیے استعمال ہونے والی ایک ترکیب کو ہم پر کیوں استعمال کرتے ہیں۔

اصل میں ہمارے اُوپر ۱۹۲۲ء والے پادریوں کے لیے ایجاد شدہ اصطلاح کو ایک نئے ہی تصور و مفہوم سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مغرب کی اقوام اکابر اب اس اصطلاح (فنڈا منٹلزم اور فنڈا منٹلسٹ) کو ہمارے خلاف اسی مفہوم میں استعمال کرتی ہیں کہ مشرق کے مسلمان جو سیکولر زندگی کے قائل نہیں اور سیاسیات و معاشیات تک کو دائرۂ دین میں داخل سمجھتے ہیں، نیز جو قانون قرآن اور احکامِ حدیث کے جملہ نصوص کو دائمی سمجھ کر ان کے نفاذ کے خواہاں ہیں، وہ چونکہ سامراجی اور تہذیبی اور ثقافتی معاملات میں ہماری غلامی اچھی طرح قبول نہیں کر سکتے، لہٰذا ہم اُن کو مذہبی تنگ نظری کا الزام دے کر فنڈا منٹلسٹ قرار دیتے ہیں۔ ان کے جو بھی طبقے ہماری تہذیبی یلغار کے مقابلے میں اپنے مذہبی اُصول و اقدار کا احیا کرنا چاہیں گے، وہ چونکہ ہمارے مخالف اور مزاحم ہیں، لہٰذا ہم ان کو ذلیل کرنے اور پست قرار دینے کے لیے ایسے الفاظ و اصطلاحات کو اُن پر چسپاں کریں گے جو ان کو انسانیت کے پست مقام پر دکھائیں۔ جیسے رُوسی ترکستان میں آزادی کی جنگ لڑنے والے مسلمانوں کو بسماچی (ڈاکو) قرار دیا گیا تھا۔ اور جیسے افغانستان میں روس کی ظالمانہ فوجی تاخت و تاراج کے بعد اس کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والوں کے لیے چھاپہ مار کی اصطلاح استعمال کی گئی، اسی طرح ہمارے پاس محبانِ اسلام کے لیے رجعت پسندی

ۛ اگر کوئی مسلمان قوم اپنی آزادی کے لیے رضا کار جاں نثاروں کے ذریعے لڑائی لڑتی ہے تو اُن لوگوں کو چھاپہ مار اور دہشت گرد کہا جاتا ہے۔

ملائیت، تنگ نظری، ماضی پرستی، سائنس دشمنی اور فنڈا منٹلزم کی گالیوں کا پورا ایک ترکش موجود ہے۔ ہمارے ایک ہاتھ میں کمزور مسلمان قوموں کو عطا کرنے کے لیے روپیہ اور اسلحہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں تذلیل و تضحیک کے تیروں کا ایک ترکش بھی ہے، نیز کسی مسلم دشمن قوم کی بڑھتی ہوئی قوت کا بھرا ہوا پستول بھی جو جغرافیائی لحاظ سے مسلمانوں کی گردن ناپنے کے قابل ہو۔

انہی دوہری قوتوں کے زور سے ہم نے مصر کو کیمپ ڈیوڈ کے معاہدے میں پھانسا جس کے نتیجے میں مصری فنڈا منٹلزم کا دم گھٹ رہا ہے۔ یہی حربہ ہم اب پاکستان کے محبانِ اسلام اور فریفتگانِ کتاب و سنّت کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ہماری کامیابی کی ضمانت یہ ہے کہ خود پاکستانیوں میں سے بلکہ عین مسلمانوں میں سے محبانِ اسلام کے خلاف ہمارے حربوں کو استعمال کرنے کے لیے مردانِ کار نکل آتے ہیں، بلکہ زنانِ کار بھی۔ اب تو ہماری پسند کی جمہوری حکومت کا اقتدار بھی ہمارا مرغِ دست آموز ہے۔

اِدھر مغرب زدہ طبقہ جسے اسلام کی پوری یا کافی معلومات بھی نہیں اور عملاً بھی وہ اسلام سے نجات یافتہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ اغیار کی ایجاد کردہ متذکرہ بالا ناپاک اصطلاحوں کو ایک مثبت اور غرض سے استعمال کرتے ہیں۔

وہ پہلے اپنے معلوماتی دائرے میں اپنے نفس کے تقاضوں اور عادات کے تحت ایک روش اختیار کرتے ہیں، لیکن جب کوئی واقفِ دین آدمی ٹوکتا ہے تو اس کی بات پر غور کرنے کے بجائے اپنے خیالات کے لیے حفاظتی جنگ لڑنے لگ جاتے ہیں اور ناپاک اصطلاحوں کے اسی ترکش کو کھول لیتے ہیں۔ آپ کہیے کہ نماز روزہ ضروری ہے۔ جواب ملے گا کہ یہ کیا اگلے وقتوں کی باتیں ہیں۔ سوال کیجیے کہ عریانی اور فحاشی منع ہے۔ جواب دیں گے کہ عریانی و فحاشی کی پہلے تعریف کیجیے اور سمجھائیے۔ آپ احکام و ہدایات سناتے ہیں تو کہیں گے کہ یہ تو فنڈامنٹلسٹوں کی باتیں ہیں۔ اب تو اجتہاد کا زمانہ ہے اور اجتہاد کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ سیاسی

سازشوں اور انتخابی جوڑ توڑ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیجیے، یا رشوت و خیانت کو ناجائز بتائیے، یا سُود اور قمار پر بحث کیجیے تو آپ خواہ قرآن کی آیات اور احادیث پڑھ پڑھ کر ہر بات کو ثابت کر رہے ہوں، ہمارے جدت مآب حضرات یہی کہیں گے کہ چھوڑیے صاحب، اب ان آیتوں حدیثوں سے بات نہیں بنے گی، یہ تو ملائیت ہے۔ ہمارا تعلق سائنسی دور سے ہے، جب کہ خلائی جہاز مریخ اور مشتری تک جا رہے ہیں۔ اب تو بات عقل سے ہوگی کہیے کہ شراب و رقص و سرود کو نہ پھیلاؤ تو جواب ملے گا کہ اس سلسلۂ تفریح کے بغیر تو نہ تعلیم گاہیں چل سکتی ہیں، نہ عام آدمی کے اضطرابات میں کمی آسکتی ہے۔ یہ فطری تقاضے ہیں اور فطری تقاضوں کی راہ میں رکاوٹ صرف ملا لوگ بنتے ہیں جو جذبۂ بنیاد پرستی کے ساتھ ماضی کا احیا کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ماضی کا احیا کبھی نہیں ہوا کرتا، حال ہمیشہ مستقبل کی طرف جاتا ہے، ماضی کی طرف نہیں جاتا۔

غرضیکہ اس طبقے نے زندگی میں اباحیت حاصل کرنے کے لیے ایک جنگ شروع کر رکھی ہے۔ اس جنگ میں ہتھیار وہی ہیں جو بیسویں صدی کے تنگ نظر عیسائی پادریوں کے خلاف استعمال کئے گئے تھے۔ جب کہ انہوں نے اپنے ناقص، کمزور، محدود، غیر مرتب اور غیر عقلی تصوراتِ مذہب کو جدید عقلیت سے ٹکرا دیا تھا۔

تو حضرات! الفاظ اور اصطلاحوں کو استعمال کرتے ہوئے ذرا احتیاط فرمائیے۔

اب چند اشارات خود نظریۂ ارتقاء کے مطابق۔

۱۔ یہ تجرباتی سائنسی عمل کا نتیجہ نہیں کہ آپ نے صراحی میں ایک دھات ڈالی، اسے گرم کیا، پھر اس پر تیزاب ڈالا، پھر گیس نکلی اور آپ نے سلنڈر میں بھر لی۔

یہ مشاہدہ بھی نہیں کہ آپ کے سامنے ایک وقت میں تمام اجزائے علم و بحث موجود ہوں، بلکہ آپ ماضی کی طرف اندازوں سے بڑھ رہے ہیں اور چٹانیں تراش کر کچھ مدفون شکستہ و بوسیدہ ڈھانچے اکٹھے کر رہے ہیں۔ پھر ہر ایک کا زمانہ متعین کرنے کی قیاسی

کوشش کرتے ہیں۔ آپ کی دریافت کردہ کچھ "کڑیاں" برسوں بنائے استدلال ہونے کے بعد جعلی ثابت ہوئیں، کچھ ابھی زیرِ دریافت ہیں ــــ کچھ اجزا، کچھ وقت کے اندازے، کچھ قیاسات (کہ یوں ہوا ہوگا) اور پھر بھی زنجیر تحقیق نامکمل۔

ایسی چیزوں کو قیاسی نظریہ کہتے ہیں، سائنٹیفک حقیقت نہیں۔

۲ ــــ اگر محض مشابہتوں سے استدلال کیا جائے اور ماحولی ضروریات کے مطابق مخلوق میں جسمانی تغیرات آنے کا اصول سامنے رکھا جائے تو اتنی سی بات سے یہ قطعی حد تک ثابت نہیں ہوتا کہ سب کا شجرۂ نسب ایک ہے۔ برابر کا ہی یہ امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام (SPECIES) کی ابتدا الگ الگ کی ہو۔ یعنی سب کے ابتدائی جرثومے اور بیضے خلق کرکے ارضی ماحول میں بکھیر دیے ہوں۔

۳ ــــ بطورِ خاص انسان میں ہم ایک چیز ایسی پاتے ہیں جو حیوانات کی کسی نوع میں نہیں ہے اور وہ ہے نیکی اور بدی، ظلم اور انصاف، معروف اور منکر کا فرق ــــ خواہ وہ کسی علاقے یا زمانے میں کتنا ہی ابتدائی درجے کا ہو۔ اس ایک امتیاز کی وجہ سے اس کے دماغی خلیات اور مختلف جذباتی مراکز میں خاص فرق ہونا چاہیے۔ اور یہ فرق ہو تو سارے بدن پر اسی کے اثرات بھی ہونے چاہئیں۔

باقی تمام حیوانات آرام اور تکلیف یا فائدے اور نقصان یا حصولِ خواہش میں کامیابی اور محرومی کو تو جبلی طور پر جانتے ہیں۔ مگر اخلاقی حاسہ ان میں نہیں ہے۔

یہی امتیاز اس بات کو کافی ہے کہ اس کی تخلیق باقی سلسلۂ عام سے الگ بطورِ خاص ہوئی ہو ــــ کیونکہ اس کو نیابتِ الٰہی یا کارپردازئ ارض کی ذمہ داری سونپی جانے والی تھی۔

۴ ــــ اصل مقصود نظریۂ ارتقاء کا یہ تھا اور ہے کہ خدا کے وجود کو بیچ میں سے نکال کر سلسلۂ کون وخلق کا مشینی انداز میں آٹومیٹک طور پر چلنا ثابت کیا جاسکے۔

مگر یہ کوشش ایک ہمہ گیر قانونی نظام کے نافذ العمل ہوتے ہوئے کامیاب نہیں ہوتی۔ اگر قانون ہے تو اس کے لیے عقل وحکمت کو موجود ہونا چاہیے، نیز نفاذِ قانون کے لیے قوتِ حکم وجبر کو بھی ہونا چاہیے۔ نظریہ ارتقاء والے بتائیں کہ یہ دو چیزیں کہاں ہیں؟ شروع میں

اتنے بڑے نقشۂ کو نبات کی منصوبہ بندی کس نے کی؟ اس کے لیے سروسامان کس نے کیے؟ اس کے لیے ترتیبِ مراحل کس نے قائم کی؟ قانونِ علّت و نتیجہ کس نے مہیا کیا؟ ماحولی اثرہ اور اس کے ساتھ قانونِ ضرورت اور قانونِ ضرورت کے ذریعے کسی حیوانی وجود میں کسی بھی نوع کی تبدیلیاں کس قوت کے تابع تھیں؟

یہ کونسی قوت ہے جو محض ضرورت پورا کرنے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ اپنے ہر عمل اور ہر مظہر میں جمال بھی پیدا کرتی ہے؟

۵- کیا ممکن ہے کہ ایک بندر کو ٹائپ مشین پر بٹھا دیا جائے اور ایک لمبا خط اس کے سامنے رکھ دیا جائے کہ وہ ٹائپ کرے۔ قانونِ اتفاق سے یہ تو ممکن ہے کہ ہزار مرتبہ ٹائپ کی کلیدوں پر ہاتھ مارنے سے کبھی کوئی ایک دو حرفی لفظ وجود میں آجائے مگر وہ ساری مرتب عبارت تو دس لاکھ سال میں بھی نہیں لکھی جاسکے گی۔ پھر کائنات کی کسی اندھی قوت کے متعلق سمجھنا کہ وہ قانونِ ضرورت اور قانونِ اتفاق کے تحت سارا پیچیدہ جھمیلا چلا رہی ہے۔ خلائی جہاز اڑ رہے ہیں، ہارٹ اپریشن ہو رہے ہیں، گردے تبدیل کیے جا رہے ہیں، ایٹم بم بن رہے ہیں۔ یہ ساری ٹیکنالوجی اگر عقل کی وجہ سے ممکن العمل ہے تو پھر نظامِ کائنات اور حیاتِ انسانی کا سلسلہ بلکہ حیوانی اور نباتی اور جمادی موجودات کا دروبست بھی ایک بسیط عقلی و ریاضیاتی نظام کے تحت ہے۔ اس کا کوئی تصور آپ خدا کے بغیر کیسے کرسکتے ہیں

آپ ذرا انسانی وجود ہی میں بناوٹوں کو دیکھیے، آنکھ کا تجزیہ کیجیے، کان کا صرف باہر کا حصہ ہی دیکھیے کہ اس کا کیا خاص انداز ہے اور کیوں؟ اگر نمونے کے بغیر آپ کو مصنوعی کان بنا کر لگانا پڑتے تو وہ سیدھا سادا ایک موٹا پردا سا ہوگا، اس کے پیچ وخم کا تو آپ تصور ہی نہیں کرسکتے۔ دورانِ خون کو دیکھیے۔ جسم کے ہر حصے کی ضروریات الگ الگ ہیں اور وہ ہر حصے کو اس کی ضرورت پہنچاتا ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے کمپیوٹر یعنی انسانی دماغ اور اس کے خلیات پر نظر ڈالیے، دل، جگر، گردوں اور ہضم کی مشینری کی کارکردگی اور سسٹم دیکھیے۔ یہ غور کیجیے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے اعضا بہت چھوٹے سائز میں ہیں اور ایک ایک کئی کام دیتا ہے۔ ذرا زبان ہی پر غور کر لیجیے۔

کبھی یہ بھی سوچیے کہ مادّی ذراتِ دماغ سے غیر مادّی خیالات و جذبات کس طرح رونما ہو کر ایک طرف سائنسی اور طبّی ترقیات کا ذریعہ بنتے ہیں اور دوسری طرف شعر و ادب اور علم و تحقیق جیسی خدماتِ عالیہ انجام دیتے ہیں ۔ پھر دماغ کا نظامِ پیغام رسانی اور موروثی اثرات کا بھی (TAPE SYSTEM) کے تابع ہونا ۔

یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی نفی کرتا ہے تو دراصل وہ اپنی ہی نفی کرتا ہے ۔ اِس لحاظ سے مروجہ نظریۂ ارتقاء حقیقتِ عظمٰی سے ٹکراتا ہے ۔

۶ ۔ انسان کا ظہور اور ارتقاء کس طرح ہوا ؟ اس کے بارے میں خود مغربی مفکرین میں آراء مختلف ہیں :

مثلاً ایک رائے تو یہی ہے کہ انسان کی تخلیق کا سلسلہ سب سے الگ ہے ۔

ایک رائے یہ ہے کہ انسانی جرثومے و بیضے کسی بیرونی کُرّے سے منتقل ہوئے ۔

ایک رائے یہ ہے کہ بڑے بڑے خلائی جہازوں کے ذریعے انسانوں سے زیادہ بھاری بھرکم مخلوق زمین پر اتری ہے ، اور ممکن ہے کہ خود انسان بھی اسی طرح کسی اور سیارے سے آیا ہو ۔

لیکن منکرینِ خدا کے گروہ کا دباؤ ہے اور وہ اپنے متعصبانہ زور سے ڈارونی ارتقاء پر نہ صرف بہت لٹریچر شائع کرتے ہیں اور ذرائع ابلاغ سے خوب کام لیتے ہیں ، بلکہ تعلیم گاہوں میں بھی انھوں نے اس مضمون کو لازم کرا دیا ہے ۔ دوسری طرف نظریۂ ارتقاء سے اختلاف کرنے والوں کے لٹریچر کو دبایا جاتا ہے اور پھیلنے نہیں دیا جاتا ۔

۷ ۔ اصل خطرناک چیز تو وہ نتیجہ ہے جو سوشل ارتقاء کے تحت تاریخ کے لیے نئے اُصول مہیا کرتا ہے ۔ مثلاً تاریخی قانون ہے ، انتخابِ طبیعی (NATURAL SELECTION) جس کے معنی یہ ہیں کہ قدرت کا نظام (یہاں پھر قانونی اور عقلی پہلو آگیا) ایسا ہے کہ وہ ناقص اور کمزور موجودات کو ختم کرتا اور توانا اور اصلح کو باقی رکھتا ہے ۔ اس کا دوسرا پہلو ہے کہ یہاں بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا ضابطہ کارفرما ہے ۔

اِس قانون کو افراد کی زندگیوں سے اُٹھا کر قوموں اور حکومتوں کی زندگیوں پر چسپاں کر دیا گیا۔ یعنی یہ کہ قانونِ فطرت کا تقاضا ہے کہ کمزور یا کم ترقی یافتہ قوموں کو کچل دیا جائے اور زیادہ قوی اور ترقی یافتہ قوم قوت حاصل کرے تاکہ انسانیت ترقی کرے۔

یہ قانون عین اُس وقت کام آیا جب مغرب کے سامراجی مشرقی اور مُسلم حکومتوں اور قوموں کو نہس نہس کر رہے تھے، دل کھول کر خونریزی اور لوٹ کھسوٹ کی جا رہی تھی۔ مزاحمت کرنے والوں کو پھانسیوں پر لٹکایا جا رہا تھا۔ اور مقامی مذہبی ادارے اور قومی زبانیں ختم کی جا رہی تھیں اور عامتہ الناس کو ذلیل کیا جا رہا تھا۔

اِس قانون نے ظالموں کو تھپکی دی کہ شاباش تم کوئی ظلم نہیں کر رہے، بلکہ فطرت کا منشا پورا کر رہے ہو اور بڑی بھاری تاریخی ڈیوٹی انجام دے رہے ہو۔ کمزوروں کو کچل دو۔

اور سوشل ارتقا کا یہی نظریہ روس، امریکہ اور ہر ظالم قوت کے ذہن میں رچا بسا ہے۔ مسلمانوں کا فلسطین چھیننے کے بعد اب نہتے عرب فلسطینیوں کو بے دریغ دریائے خون میں غرق کر رہا ہے، راجیو صاحب کے ہاں مسلمانانِ کشمیر اپنی جگہ اور بھارت کی مُسلم اقلیت اپنی جگہ کُچلی جا رہی ہے۔ حبشہ میں، برما میں، یونان میں، موروِلینڈ میں، بلغاریہ میں، رُوس میں ــــ ہر جگہ مسلمان اقلیتیں جُرمِ ضعیفی کی سزا بھگت رہی ہیں۔ مگر ان کے ضمیر اور ان کے ایمان ابھی تک زندہ ہیں۔

تاریخ میں ایک نظریہ اگر یہ تباہی اور انسان آزاری پیدا کرتا ہے۔ کمزوروں کے خلاف قوت والوں کو تباہ کاری کے لیے اُٹھاتا ہے۔ فرد اور فرد اور طبقوں کے درمیان ہر قسم کے اخلاقی احساسات کو ختم کر کے یہ روش پیدا کر دیتا ہے کہ طاقت والا کمزور سے فائدہ اُٹھائے تو ایسا فاسد اور فساد انگیز نظریہ برحق نہیں ہو سکتا۔

اس ذلیل نظریے کی مخالفت اگر آدمی کو فنڈامنٹلسٹ بناتی ہے تو سو بار بنائے، بلکہ چھاپہ مار اور رہائی جیکر بھی کہیے، سر آنکھوں پر۔

بس ایک آخری بات یہ سن لیجیے کہ آپ لوگ جو مغربی لبرلزم کے مزے اسلام کے نام پہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور سیکولر اسلام کی اصطلاحیں وضع کرتے ہیں، وہ اپنے مشن میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ مسلمانوں کے بچے اور بچیاں جب قرآن میں حدود اللہ کی باتیں پڑھیں گے اور مواعظ اور خطبوں میں اور کتابوں اور تحریروں میں جرائم اور گواہیوں کے معیار اور سزاؤں کے بارے میں آیات بھی عوام کے سامنے آئیں گی اور رسولؐ پاک کی سنت بھی تو وہ آپ کے پروپیگنڈے کو ٹھکرا کر اپنے ضمیروں میں دینی حقائق کو جگہ دیں گے۔ آپ ہزار بار انہیں ملّا اور فنڈامنٹلسٹ اور رجعت پسند اور ہائی جیکر اور وحشی کہیے۔ وہ کسی کی گالیوں کے دباؤ سے اپنے ایمان اور اپنے علم کی نفی نہیں کر سکے۔ آپ ایک لہر کو دس برس میں روکیں گے پھر دوسری لہر اُٹھے گی، اُسے روکیں گے تو تیسری لہر اُٹھے گی۔ یہی ساری تاریخ میں ہوتا آرہا ہے۔ جب تک اس قوم کے سامنے کوئی گروہ اسلامی اصول و مقاصد کو عملاً جلوہ گر نہیں کر دیتا اس وقت تک آپ اپنی ہی قوم کی قوتیں برباد کرتے رہیں گے اور اس کے ساتھ خود آپ کی قوتیں بھی برباد ہوتی رہیں گی۔

بہتر یہی ہے کہ آپ اسلامی دین و تہذیب اور اس کے تقاضوں کے خلاف لڑائی بند کر دیں۔ اس لڑائی میں یزید سے بڑھ کر کوئی جیتنے والا نہیں نکلا اور نہ یزید سے بڑھ کر ہارنے والا کوئی نکلا ہے!

حکمتِ سید مودودیؒ

"آزادی"

(۱۴ اگست ۱۹۸۹ء کے حوالے سے)

آزادی کا ایک مفہوم غیروں کی غلامی سے آزاد ہونا ہے۔ آزادی کا دوسرا مفہوم ایک قوم کی حیثیت سے خود اپنے ملک میں آزاد ہونا ہے اور آزادی کا ایک اور مفہوم جو خاص ہمارے لیے ہے وہ ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے آزاد ہونا ہے۔

(آزادی جبھی ہوتی ہے کہ وہ تینوں معنوں میں حاصل ہو، مگر مسلمان کے لیے آزادی کا تیسرا مفہوم بے حد اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی آزادی حاصل نہیں ہو سکتی اور حاصل ہو تو اس کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ آزادی کا تیسرا پہلو آزادی کے شجر کا برگ و بار ہے۔ ن۔ ص)

ہم مسلمان قوم ہیں، محض ایک قوم نہیں ہیں ——— ہمیں آزادی ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے درکار ہے اور مسلمان قوم کی حیثیت سے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہم جہاں انفرادی حیثیت میں خدا کی بندگی کے لیے آزاد ہوں وہاں بحیثیت قوم کے خدا کے احکام کی اطاعت کرنے کے لیے بھی آزاد ہوں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم خدا کے دیئے ہوئے قانون کو نافذ کرنے کے لیے آزاد ہوں اور اس تہذیب کی پیروی کرنے کے لیے آزاد ہوں جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے۔ اگر اس لحاظ سے ہم آزاد نہ ہوں تو ہماری آزادی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔
اب آپ دیکھیے کہ ہمیں اپنے ملک پاکستان میں آزادی کس غرض کے لیے درکار ہے۔

کیا ہم ناچ اور گانے کی آزادی چاہتے ہیں ؟ کیا ہم جوا کھیلنے کی آزادی چاہتے ہیں ؟ کیا ہمیں عریانی، فحاشی اور بے شرمی و بے حیائی کی آزادی درکار ہے ؟ ان چیزوں میں سے کونسی آزادی ہے جو ہمیں انگریزوں کے زمانے میں میسر نہ تھی ؟ اور اگر ملک تقسیم نہ ہوتا اور ہندوؤں کے ہاتھ میں حکومت آتی تو ناچ گانے سے ہمیں منع کرنے والا کون تھا ؟ جوئے، شراب اور زناکاری سے منع کرنے والا کون تھا ؟ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی آزادی ہمیں درکار نہ تھی - ہمیں اس بات کی آزادی بھی درکار نہ تھی کہ ہم غیر اسلامی قوانین بنائیں اور غیر اسلامی قوانین چلائیں- ہمیں اس بات کی بھی آزادی درکار نہ تھی کہ ہم اسی طرح کے الحاد و دہریت سکھانے والی تعلیم جاری رکھیں جو انگریز کے دور میں جاری تھی

ہمیں جس غرض کے لیے آزادی درکار تھی وہ تو یہ تھی کہ انگریزوں نے ہمارے جن قوانین کو منسوخ کیا تھا ہم انہیں پھر سے جاری کرنے کے قابل ہوں - انگریز نے ہماری جس تہذیب کو مٹایا تھا ہم اس کو پھر تازہ کریں - انگریز نے ہمارے جس اخلاق کا ستیاناس کیا تھا ہم اسے پھر زندہ کریں - انگریز نے ہماری تعلیم کو جس طرح ختم کیا تھا ہم اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اپنی آئندہ نسلوں کو دیں تاکہ وہ مسلمان بن کر اٹھ سکیں - یہ غرض تھی ہماری آزادی حاصل کرنے کی - کیونکہ جو آزادی مسلمان قوم میں اسلامی اقدار، اسلامی تہذیب اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بنے اُس آزادی کی حفاظت مسلمان کبھی نہیں کر سکتا - دنیا کی کوئی دوسری قوم کسی دوسری چیز کے بل بوتے پر اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے لڑ سکتی ہے - لیکن مسلمان اگر جان دے سکتا ہے تو صرف ایمان کے لیے - وہ جس ایمان کو عزیز رکھتا ہے، اس کے ضائع ہونے کا خطرہ اُسے سربکف بنا سکتا ہے - لیکن سرے سے اس کے ایمان ہی کی جان نکال دی جائے تو اس کے بعد وہ محترک کیا رہ جاتا ہے جس کے لیے وہ جان دے گا -

(تقریر مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ، باغ بیرون موچی دروازہ میں
۱۲ ویں یوم آزادی کے موقع پر -)
بہ آمد کردہ : یوسف صاحب رکن ادارہ معارف اسلامی منصورہ -

صِبغۃُ اللہ

جناب حافظ محمد ادریس صاحب

جماعتِ اسلامی اسلام آباد شہر نے ۲۳ جون ۱۹۸۹ء بروز جمعہ المبارک اپنے کارکنوں کی تربیتی نشست مسجد الشہداء آب پارہ مارکیٹ اسلام آباد میں منعقد کی۔ مجھے اس نشست میں صبغۃ اللہ کے موضوع پر گفتگو کی دعوت دی گئی تھی۔ حسبِ پروگرام میں نے تربیت گاہ میں حاضر ہو کر مجوزہ موضوع پر اپنی گذارشات پیش کیں۔

۲۸ جون کو مجھے اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک تربیت گاہ میں خانس پور جانا تھا۔ صبح کی پرواز سے راولپنڈی پہنچ گیا۔ الاکرام میں جمعیت کے ساتھیوں کا منتظر تھا۔ جیب میں سے خانس پور کے موضوعات پر تیار کیے گئے نوٹس نکالے تو صبغۃ اللہ والا قرطاس بھی نکل آیا۔ نکات اس پر درج تھے اور تقریر کی تفصیلات ذہن میں ابھی تازہ تھیں۔ بریف کیس سے قلم کاغذ نکالا اور لکھنا شروع کر دیا۔ کچھ حصہ وہیں لکھا گیا اور باقی ماندہ لاہور آ کر مکمل ہو گیا۔ اس طرح یہ مضمون تیار ہو گیا جو نذرِ قارئین ہے۔

انسان فطری طور پر رنگ و بُو کا دلدادہ ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کی عارضی رہائش کے لیے جس کُرۂ ارض کا انتخاب فرمایا ہے۔ یہ بھی عالمِ رنگ و بُو کہلاتا ہے۔ یہاں ہر روز رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں، رنگا رنگ پرندے اپنی اپنی مخصوص زبان میں نغموں کا ایک رنگ باندھ دیتے ہیں۔ تتلیاں پھول پر بیٹھتی، اُڑتی اور دل کو لبھاتی ہوئی اپنے متنوع رنگوں کے ساتھ کتنی بھلی لگتی ہیں!! جانور، انسان، نباتات، پھل، معدنیات، پہاڑ، مٹی، غرض ہر چیز میں رنگوں کا تنوع اور حُسن پایا جاتا ہے۔ قوسِ قزح کا منظر تو

قدرت کبھی کبھار دکھاتی ہے مگر قوس وقزح کے سارے بلکہ ان سے بھی نہ اتر رنگوں کی بوقلمونیاں کائنات میں ہر جانب پھیلی ہوئی ہیں۔

انسان نے خود بھی رنگ ایجاد کیے اور ان کے مرکبات سے نئے نئے رنگ وجود میں لایا۔ ادیبوں نے مناظرِ فطرت کے اپنے ذوق کے مطابق نقشے کھینچے اور شاعروں نے ان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے مطابق رنگ بھرے۔ دُنیا کی ہر زبان میں مناظرِ فطرت کی عکاسی کرنے والے عالی دماغ اہلِ قلم وزبان نے رنگوں کا خوب خوب تذکرہ کیا ہے۔

ہمارے اپنے ملّی شاعر اور ترجمان اقبالؒ نے کہا ہے۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اُکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گُل پہ رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حُسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بَن

یہ مناظرِ قدرت کی کتنی حسین عکاسی ہے۔ اِسی سے ملتی جلتی تصویر علامہ اقبالؒ نے ساقی نامہ کے ابتدائی اشعار میں بھی کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار | اِرم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن | شہیدِ ازل لالۂ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں | لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور | ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

انسان مختلف رنگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ لباس، مکان، سامانِ زیست، متاعِ معیشت، سواری، غرض ہر چیز کا فیصلہ کرنے میں رنگ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

رنگوں کے بارے میں انسان کا ذوق بدلتا رہتا ہے، کبھی ایک رنگ سے دل بھر جاتا ہے تو اُسے تبدیل کر دیتا ہے۔ کبھی ایک پسندیدہ رنگ سے زیادہ پُرکشش رنگ نظر آتا ہے تو اُس کے حق میں فیصلہ صادر ہو جاتا ہے۔

بیرونی اور ظاہری ساز و سامان کی طرح خود انسان کی اپنی زندگی اور باطن کا بھی ایک رنگ ہوتا ہے۔ ظاہر کی طرح یہ باطنی رنگ بھی تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی رنگ میں پوری زندگی گزار دیں۔ ظاہری لباس میں جس طرح بعض لوگوں کو شوخ اور بھڑکیلے رنگ پسند ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کو دھیمے اور سپاٹ رنگوں سے پیار ہوتا ہے اُسی طرح باطنی زندگی کا بھی معاملہ ہوتا ہے۔

آج مجھے آپ حضرات نے جو موضوع دیا ہے وہ ہے "صبغۃ اللہ" یعنی اللہ کا رنگ۔ اِس رنگ کا ذکر خود اللہ نے اپنی زندہ و لازوال کتاب القرآن الحکیم میں کیا ہے۔ ارشاد ہے:

"اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟
(کہہ دو) اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں" (سورہ البقرہ - ۱۳۸)

اِس آیت کا ایک ترجمہ مفسرین قرآن نے اُردو زبان میں یہ بھی کیا ہے:

"ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا اور اس کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں"۔

دونوں ترجمے درست ہیں اور دل کو لگتے ہیں۔

اِس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کا تذکرہ کیا ہے۔ ان انبیاء کے پیروکاروں نے صبغۃ اللہ چھوڑ کر دوسرے رنگ اختیار کر لیے تھے۔ خصوصاً یہودیوں نے تو یہودیت ہی کو اصلی رنگ سمجھ لیا تھا۔ اِسی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی روایتی اصطباغ (بپتسمہ) ہی دین کی بنیاد بن کر رہ گیا تھا۔ لِلّٰہیت کو جو انبیاء کی بعثت کا مقصدِ حقیقی اور ان کے پیغام کا جوہرِ اصلی تھا، فراموش کر دیا گیا تھا۔ اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر ایمان لانے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ رنگ تمہیں اللہ ہی کا اپنانا ہوگا۔ سوال یہ ہے

کہ اللہ کا رنگ کونسا ہوتا ہے۔ ہم نے مختلف رنگوں کے نام تجویز کر رکھے ہیں۔ ہم ان رنگوں کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ رنگ چند ایک نہیں، بلکہ بے شمار ہیں، ان میں سے کونسا رنگ اللہ کا رنگ ہے۔ سفید، سیاہ، سُرخ، سبز، زرد، نیلا.... کونسا رنگ؟ نہیں، ان میں سے کوئی بھی رنگ نہیں جسے رنگوں کے خالق کا رنگ کہا جائے۔ وہ ایک ایسا رنگ ہے جس کی کوئی مثال ان رنگوں میں نہیں ملتی۔ نہ اُسے سر کی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، نہ اُسے کسی رنگ کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہ (شوریٰ - ۱۱)

(کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے)

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (انعام - ۱۰۳)

(نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے)۔

یہ وہ رنگ ہے جس کی محض ایک جھلک ان لوگوں کے شب و روز میں نظر آتی ہے، جو اللہ کے ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا ہو جانا کتنے عظیم مقام و مرتبے کا حامل ہے۔ مگر اس عظیم مقام کو حاصل کرنے والے ہر دور میں قلیل رہے ہیں۔ یہ مشکل گھاٹی ہے اور سہل پسند انسانوں میں سے کم ہی مشکل گھاٹیوں کو عبور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔" فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ..... (مگر انسان نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی)۔ (البلد - ۱۱)۔

یہ رنگ کتنا حسین، کتنا پیارا، کتنا پختہ اور کتنا قابلِ اعتماد ہوتا ہے، نہ کبھی اُترتا ہے، نہ پھیکا پڑتا ہے بشرطیکہ اس رنگ میں رنگ جانے والا اس کی حقیقی قدر و قیمت سے باخبر ہو جائے اور اس کی لذت سے آشنائی حاصل کرلے۔ بعض اوقات کوئی شخص اس رنگ سے ملتا جلتا رنگ اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے۔ دیکھنے والے کی آنکھیں (صاحبِ بصیرت نہ کہ صاحبِ بصارت) تو پہچان لیتی ہیں کہ رنگ اصلی نہیں بلکہ جعلی ہے مگر عام لوگ اسے اصلی ہی سمجھتے رہتے ہیں کیونکہ ہر شخص اتنا باریک بین نہیں ہوتا جو اس لطیف فرق کو سمجھ سکے۔ ہاں البتہ جس کی جانب یہ رنگ منسوب ہوتا ہے وہ چاہے تو

کبھی کبھار جعلی رنگ والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی میں ان کا بھانڈا کیا پھوڑنا، ایک دن خود ان کا رنگ پکار اُٹھے گا کہ میں اصلی نہیں، جعلی تھا، مگر کبھی کبھار وہ اس دُنیا میں بھی ان جھوٹے دعوے داروں کی قلعی کھول دیتا ہے۔

صبغۃ اللہ سدا بہار رنگ ہے۔ اس رنگ میں رنگ جانے والوں کو ایک نظر دیکھ کر دل پکار اُٹھتا ہے کہ اس کائنات کا حُسن انہی کے دم قدم سے ہے۔ یہی زمین کا نمک اور یہی پہاڑی کا چراغ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ صبغۃ اللہ کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ یوں تو نمونے بے شمار ہیں اور ہر نمونہ اپنی مثال آپ ہے، مگر اس مختصر نشست میں چند ایک نمونوں پر ہی اکتفا کرنا ہو گا۔

پہلا نمونہ میں نے سیدنا عثمان بن عفانؓ کی سیرت سے منتخب کیا ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ نمونہ چُنا ہے جس آیت میں صبغۃ اللہ کا ذکر ہے اس کے بارے میں ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ شہادت کے وقت حضرت عثمانؓ کے خونِ مقدس کا ایک چھینٹا اس آیت پر بھی پڑا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس رنگ میں رنگ جانے کے بعد اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب سے ایسا گہرا تعلق قائم کر لیا تھا جو کبھی کمزور نہ ہوا۔ ابتلاء و آزمائش میں بھی یہ رنگ پھیکا نہ پڑا اس لیے کہ اصلی رنگ تھا اور اصلی رنگ کبھی نہیں اُڑتا۔ مصحفِ عثمانی کا وہ نسخہ جو شہادت کے وقت حضرت عثمانؓ کے زیرِ مطالعہ تھا، تاشقند میں کئی لوگوں نے اُسے دیکھا۔ بعض لوگوں نے اپنے سفرناموں میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ مصحف شریف کے پہلے سیپارے کے آخر میں جہاں صبغۃ اللہ والی آیت ہے، خون کے چھینٹوں کے آثار اب تک اس صفحے پر موجود ہیں۔ امام مظلوم کے خونِ مقدس سے رنگین ہونے والی آیات کا ترجمہ ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لینا چاہیے۔

"وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اطمینان رکھو کہ اُن کے مقابلہ میں اللہ تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے، وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو گا۔" (سورۃ البقرہ، آیات ۱۳۷-۱۳۸)

ابن سعد نے بھی طبقات میں یہی لکھا ہے کہ خون کے چھینٹے ان آیات پر پڑے (طبقات

ابن سعد۔ بحوالہ سیرت حضرت عثمان غنی از ابن شکور صفحہ ۱۳۲-۱۳۳)

سیّدنا عثمانؓ آسمانِ ہدایت کے ستاروں کے درمیان ایک تابناک ستارے کی حیثیت سے جگمگاتے رہیں گے۔ ان کے مناقب و فضائل سے حدیث و تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان تفصیلات کا نہ یہ موقع ہے نہ اِس وقت اُن کی فہرست گنوانا پیشِ نظر ہے۔ یہاں آنجنابؓ کی حیاتِ مقدسہ کے آخری لمحات سے چند روشن کرنیں دکھانا مقصود ہے۔

مصر سے آنے والے بلوائیوں نے مدینہ منوّرہ میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اُنھوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ عمر رسیدہ خلیفۂ راشد اپنے گھر میں محصور ہو گئے تھے۔ مدینہ کے کنوؤں کا پانی بھی اس گھر تک نہ پہنچنے دیا جا رہا تھا۔ شب زندہ دار خلیفہ راتیں نوافل اور تلاوتِ قرآن میں گزارا کرتے تھے اور دن کو روزے سے ہوتے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لیے اُن کے پاس کئی راستے تھے، مگر انھوں نے ان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار نہ کیا۔ کیونکہ ہر ننبا دل میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ تھی۔ یہ رکاوٹ کسی اور کی طرف سے نہیں تھی، بلکہ رسالت مآب کی احادیث نے پابند کر رکھا تھا۔ صبغۃ اللہ کا اصل امتحان تو ایسے ہی وقت میں ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت موجود تھی اور وہ خلیفۂ راشد کے اشارۂ ابرو پر فسادیوں سے جنگ لڑنے کے لیے آمادہ تھے، مگر خلیفۂ راشد نے اپنی جان بچانے کے لیے مدینہ کی حرمت کو حلّت میں بدلنے سے انکار کر دیا۔ اُن کے سامنے اپنے آقا و مولا کا یہ ارشاد تھا:

”حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس میرے بعض صحابیؓ کو بُلا دو۔ میں نے کہا، حضرت ابوبکرؓ کو؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، مَیں نے کہا حضرت عمرؓ کو؟ آپؐ نے فرمایا۔ نہیں، میں نے کہا حضرت عثمانؓ کو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، جب حضرت عثمانؓ آئے۔ آپؐ نے مجھ سے فرمایا تم ہٹ جاؤ، آپؐ حضرت عثمانؓ سے سرگوشی کرتے جاتے تھے اور عثمانؓ کے

چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا، جب یومِ دار ہوا (جس دن حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیا گیا تھا) اور ان کا گھر میں محاصرہ کر لیا گیا تو ہم نے کہا اے امیر المومنین آپ ان محاصرین سے کیوں نہیں لڑتے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ میں اس پر صبر کروں گا۔ ایک روایت میں اس کے آگے یہ اضافہ ہے کہ حضرات صحابہ کا یہ خیال ہے کہ وہ سرگوشی یا وہ معاہدہ اسی دن کے لیے تھا۔" (مسند احمد، ابن سعد، البدایہ والنہایہ)

ان سے اُن کے چچازاد بھائی اور طاقت ور گورنر امیر معاویہ بن ابوسفیان نے درخواست کی تھی کہ یا تو شام سے فوجیں منگوا لیں اور یا خود مدینہ چھوڑ کر شام چلے آئیں مگر انہوں نے فوجیں بلوانے سے انکار کر دیا کہ اس طرح تو مدینہ میں خونریزی ہوگی اور مدینہ سے دمشق چلے جانے کو بھی قبول نہ کیا کہ مدینہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جوار تھا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ نے بھی آپ سے عرض کیا تھا کہ یا تو باغیوں سے لڑنے کا حکم دیں یا شام چلے جائیں اور یا مکہ کا رُخ کریں اور وہاں جا کر مقیم ہو جائیں، مگر آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

"اگر میں نکلوں اور ان سے لڑوں تو میں ہرگز وہ پہلا آدمی رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے بعد نہیں ہونا چاہتا جو آپ کی اُمت میں خونریزی کرے اور اگر میں مکہ معظمہ چلا جاؤں تو یہ لوگ میرے خون کرنے کو حلال نہ سمجھیں گے مگر میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے۔ آپؐ فرماتے تھے قریش کا جو آدمی مکہ میں بے دینی کرے گا اس کے اوپر تمام عالم میں سے آدھا عذاب ہوگا اور میں ایسا قریشی نہیں ہونا چاہتا۔ (اور مجھے اپنے نفس پر کیا اعتبار) اور یہ کہ میں مُلک شام چلا جاؤں، شام والے، شام والے ہیں۔ اور ان میں حضرت معاویہ بھی ہیں، مگر میں اپنے مقام ہجرت کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

(مسند احمد۔ البدایہ والنہایہ)

وہ فسادیوں کے مطالبہ کو قبول کر کے بھی جان بچا سکتے تھے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ خلافت سے دست بردار ہو جائیں۔ مگر یہ مطالبہ کیسے مانا جا سکتا تھا جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے سامنے تھا۔

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" اے عثمانؓ! اُمید ہے کہ خداوند تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا تو لوگ اس کو اُتارنا چاہیں تو تم مت اُتارنا"۔ (جامع ترمذی۔ مسند احمد)

تاریخِ انسانی میں بڑے بڑے مظالم ڈھائے گئے۔ امام مظلوم سیدنا عثمان بن عفانؓ کی شہادت مظلومیت کی انتہائی دردناک داستان ہے۔ آخری ایام کا ہر لمحہ پہاڑ تھا۔ ہر لمحے کی تفصیل تاریخ میں درج ہے۔ ہر لمحہ صبغۃ اللہ میں رنگی ہوئی اس شخصیت کی عظمت پر گواہ ہے۔ دُنیا سے رُخصت ہو جانے سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔

"حضرت عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان کے پاس آیا تاکہ انہیں سلام کروں اور آپ محصور تھے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے کہا" میرے بھائی کے لیے مرحبا میں نے آج رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دریچے میں یا اس گھر کی دریچے میں دیکھا ہے، آپؐ نے فرمایا اے عثمان! ان لوگوں نے تیرا محاصرہ کر رکھا ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا تجھے پیاسا کر دیا ہے؟ یعنی پانی روک لیا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں تو آپؐ نے دریچے میں سے ایک ڈول لٹکایا جس میں پانی تھا۔ میں نے اُسے پیا۔ یہاں تک کہ میں سیراب ہو گیا۔ اور میں اس پانی کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں اور دونوں کندھوں کے درمیان محسوس کرتا ہوں اور آپؐ نے مجھ سے فرمایا اگر تمہارا منشا ہو تو اُن کے خلاف تمہاری مدد کی جائے اور اگر تم چاہو تو ہمارے پاس افطار کرنا۔ میں نے اس بات کو اختیار کر لیا ہے کہ آپ کے پاس افطار کروں گا"، پس یہ اسی دن شہید کر دیئے گئے۔ (البدایہ والنہایہ)

صبغۃ اللہ میں رنگ جانے والے فرد کو اپنے اہل خانہ اور جملہ متعلقین کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ شکایت عام ہے کہ تحریکِ اسلامی کے کام میں گھر والے، بیوی بچے، عزیز رشتہ دار تعاون نہیں کرتے بلکہ بسا اوقات رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں بازپرس ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے کسی شخص کو صبغۃ اللہ کی نعمت عطا فرمائی ہے تو اُسے اس نعمت کو اپنے گرد و نواح میں عام کر دینا چاہیے۔ اگر یہی رنگ اس کے اہل و عیال پر چڑھ جائے گا تو اُسے ہر کٹھن منزل سہل نظر آنے لگے گی۔ اُسے اطمینانِ قلب حاصل ہوگا اور مشکل فیصلے آسان ہو جائیں گے۔ (باقی)

اسلام میں عورت کی شہادت

اُمِّ حسن - منصورہ، لاہور

عورت کی شہادت — اعتراضات، طنز اور استہزا

ایک مدتِ دراز سے ہمارے ہاں اسلامی قوانین معطل ہوچکے ہیں اور اسلام کا اجتماعی نظام منہدم ہوچکا ہے۔ اس کی جگہ مغربی تہذیب کے پروردہ مسلمان اپنے اپنے اسلامی ملک میں انگریزی قانون رائج کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ بدقسمتی سے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی یہ مہم پورے زور شور سے جاری ہے۔ موجودہ حکومت اور اس کے حواری تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ اور لبرل معاشرہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئے دن اسلامی قوانین کی یکے بعد دیگرے "تدوینِ نو" کے نام پر بیخ کنی کرتے رہتے ہیں — اور "اجتہاد" کے نام پر تمام اسلامی قوانین کی اسلامی رُوح کو ختم کر کے اس کو مغربی رنگ دینا چاہتے ہیں۔ کبھی وزیرِ قانون کا یہ اعلان ہوتا ہے کہ حدود آرڈی نینس اور اسلام کا قانونِ شہادت خلافِ انسانیت اور ظالمانہ ہے۔ ہم اس کو ختم کر کے دم لیں گے۔

کبھی مغرب زدہ خواتین، اسلام کی طرف سے عورتوں کو دیئے گئے حقوق و فرائض پر چیں بجبیں ہوتی ہیں اور اسلام آباد میں مظاہرے کرتی نظر آتی ہیں کہ "جب عورت کی وراثت آدھی ہے، دیت آدھی ہے، شہادت آدھی ہے تو پھر اس کا روزہ، اس کی نماز، زکوٰۃ اور حج بھی آدھا کیا جائے۔"

کبھی اسلامی قوانین کا مذاق اُڑانے والوں کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں سامنے آتا ہے۔

"جب تم کہتے ہو کہ عورت کی شہادت آدھی ہے تو غور کرو اس کی زد کہاں جا پڑتی ہے۔ تمہاری ایک بیوی تو آدھی ہوئی، دو عورتیں ملیں گی تو مکمل بیوی بنے گی"۔ کبھی وفاقی شرعی عدالت کے ایک سینئر جج عورت کے نصف حقِ شہادت کے مسئلہ پر ایک خاتون سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔ "حیرت ہے کہ تم عورت ہو کر عورت کی نصف شہادت والے قانون کو درست اور معقول سمجھتی ہو"۔ کبھی کہا جاتا ہے "عورت کو نصف حقِ شہادت دے کر عورت کی توہین اور تحقیر کی گئی ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اور رسول اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ایسی گستاخانہ باتیں سوچنا اتنی ناپاک جسارت ہے جس کی سزا سے مسلمان نہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکتے ہیں نہ آخرت میں۔ اللہ ہمیں مخلص مومن بنائے اور عذاب سے محفوظ رکھے۔

اپنے اس مقالے میں عورت کی نصف شہادت کے مسئلے پر بحث کر کے میں جو ایک عورت ہوں اور خود عورت کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ عورت کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کے دائرہ کار کے لحاظ سے اسلام ہی کا نقطۂ نظر درست اور معقول ہے۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گمراہی اور جہالت ہے۔ واللہ المستعان

میں کوئی عالمہ فاضلہ تو نہیں ہوں مگر جو تھوڑی بہت سوجھ بوجھ ہے، اس کے مطابق اس مضمون میں پہلے عورت کے حقوق و فرائض اور دائرہ کار کے بارے میں مختصر سی بحث کی گئی ہے۔ پھر "شہادت" پر تھوڑی سی بحث ہے اور اس کے بعد اسلام کا موقف واضح ہو جائے گا اور مسئلہ کی صحیح نوعیت سامنے آ سکے گی۔

اسلام — فطری نظامِ حیات اسلام کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے خلاف لڑتا ہے، نہ اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا ہے، بلکہ اس کے لیے وہی اصول و قانون وضع کرتا ہے جو اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ان کی بہترین انداز سے تربیت اور تہذیب کر کے اُسے روحانی ترقی اور پاکیزگی سے بہرہ ور کرتا ہے تاکہ انسان اپنی خواہشاتِ نفس کا بندہ نہ رہے، بلکہ نیکی اس کی نگاہوں میں پسندیدہ ہو اور وہ نیکی اور احسان کے اعلیٰ ترین مقام کو بھی پا سکے اور انسانی معاشرہ

بھی فلاح وکامرانی سے بہرہ ور ہوسکے۔

عورت اور مرد میں مساوات اور فرق

اگر طبعی حقائق کو سامنے رکھا جائے تو مرد اور عورت کے مسئلہ میں اسلام کا نقطہ نظر بڑا واضح اور صاف ہے اور انسانی فطرت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ جہاں انسانی فطرت دونوں کے درمیان مساوات چاہتی ہے وہاں تو اسلام دونوں کو یکساں سطح پر لاتا ہے اور جہاں خود فطرت امتیاز چاہتی ہے وہاں احکام و مسائل میں اسلام دونوں صنفوں میں فرق اور امتیاز قائم کرتا ہے۔ چنانچہ شرفِ انسانی اور ایمانی شرافت میں دونوں کا درجہ یکساں ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل-۷۰) یعنی ہم نے تمام بنی آدم کو عزت بخشی جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔ دونوں ایک باپ حضرت آدمؑ اور ایک ماں حضرت حواؑ کی اولاد ہیں۔ شرافتِ ایمانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَآ اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ــ (آل عمران-۱۹۵) "میں کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا، عمل کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت"۔ اس طرح نیکی اور تقویٰ میں دونوں کا اجر اور مرتبہ اللہ کے ہاں برابر ہے۔ بلکہ اگر کوئی عورت ایمان اور تقویٰ میں مرد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر اور مرتبہ بھی ایمان و تقویٰ میں پیچھے رہ جانے والے مرد سے بڑا ہوگا۔ ملاحظہ ہو ارشاد قرآنی: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات-۱۳) "تم میں سے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے۔

بنیادی انسانی حقوق میں مساوات

اسی طرح بنیادی انسانی حقوق میں بھی مرد و عورت کے درمیان مساوات اور یک رنگی ہے، بلکہ عورت کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔ بیٹی، بہن، پھر اس کے بعد بیوی اور آخر میں ماں چاروں حیثیتوں میں اللہ و رسولؐ نے عورت کو بڑا مقام دیا ہے۔ اور ماں کا مقام و مرتبہ تو اتنا بلند ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے رکھ دی گئی ہے۔ باپ کے مقابلے میں ماں تین گنا

زیادہ حسنِ سلوک کی مستحق قرار دی گئی ہے۔[1]

صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں فرق قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے: لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ-۲۲۸) "عورتوں کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح اُن کے فرائض ہیں، مگر مردوں کو ایک درجہ زائد حاصل ہے۔

سورہ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (النساء-۳۴) "مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس وجہ سے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر زیادہ صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں"۔ صنفِ نازک کی جسمانی کمزوری تو سب کو معلوم ہے اور عقلی طور پر عورت کا مرد سے کم ہونا خود ارشادِ رسولؐ سے ثابت ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الحیض ص ۴۴، وکتاب الشہادات جلد ۱ ص ۳۶۳۔

عورت کا دائرۂ کار چنانچہ عورت کی صلاحیتوں، اس کے مزاج اور استعداد کار کے لحاظ سے اس کی ذمہ داریاں بھی الگ نوعیت کی ہیں۔ ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ تمام مسلمان عورتوں کو حکمِ الٰہی ہے: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (سورۃ احزاب-۳۳) "اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ جم کر بیٹھی رہو"۔ مفسرین کے نزدیک اس آیت کی رُو سے تمام مسلمان خواتین کو حکم ہے کہ وہ گھروں کے محاذ پر جمی رہیں اور اگر باہر نکلنے کی ضرورت ہے تو پردے کی پابندی کریں۔

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: وَيُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ (احزاب ۵۹) "اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلّو لٹکا لیا کریں"۔

سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث عورت کے دائرۂ کار کو بخوبی واضح کر رہی ہے:

---

[1] کیا کبھی کسی باپ نے بھی اس پر احتجاج کیا کہ میرا درجہ ماں کے درجہ سے تین حصّے کیوں کم تر ہے اور جنت میرے قدموں تلے کیوں نہیں؟ (مؤلف)

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰی بَیْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِیَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ

یعنی عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہداشت کرنے والی ہے اور اس سے ان کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیمِ کار کائنات کی فطری روش سے ہم آہنگ ہے اور اسی سے کائنات کا حُسن و جمال قائم ہے۔

عورت کا فطری دائرۂ کار متعین ہونے کے بعد "شہادت" پر بحث کرنا ضروری ہے۔

لفظ "شہادت" کی تحقیق | شہادت کے لغوی معنی خبر قاطع یعنی فیصلہ کُن بیان یا ثبوت جو کسی متنازعہ مسئلہ میں فیصلہ کُن رائے قائم کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ مقدمات و معاملات کے فیصلے عموماً چار دلیلوں کی بنا پر کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ملزم کا اقرار ۲۔ شہادت ۳۔ حلف یا قسم اور ۴۔ قرائن۔ یعنی — (CIRCUMSTANCIAL EVIDENCE)۔ جہاں ملزم خود اقرار نہ کر رہا ہو وہاں فیصلہ کرنے کے لیے قاضی کو شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلام میں شہادت کو اس کی اہمیت کے پیش نظر بڑی اہمیت حاصل ہے۔

قرآن میں لفظِ شہادت کبھی تو مشاہدہ کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ میں نَشْهَدُ سے مراد گواہی دینا ہے۔ کبھی قسم کے معنوں میں (مثلاً لعان کے ضمن میں اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ سے مراد قسم کھانا ہے)۔ اور کبھی خبر کے معنوں میں۔ مثلاً رؤیتِ ہلال کے سلسلے میں لفظ شہادت ہمیشہ خبر کے معنوں میں ہوتا ہے — مگر جب یہ لفظ مقدمات اور معاملات کے ضمن میں آئے گا تو اس سے مراد عدالت میں کسی خاص صورتِ حال کے بارے میں قسم کھا کر صحیح اور درست صورتِ حال بیان کرنا ہے۔

اسلام میں شہادت کی اہمیت | معاشرے عدل و انصاف ہی کی بنا پر استوار ہوتے ہیں اور رہتے ہیں۔ لہٰذا اسلام میں شہادت کو فرض کفایہ شمار کیا گیا ہے، جس کو صحیح صورت حال معلوم ہو اس کا فرض ہے کہ وہ درست اور سچی گواہی دے تاکہ مقدمہ کا صحیح فیصلہ ہو، بے قصور بَری ہو، حقدار اپنا حق وصول کر سکے اور مجرم سزا پا سکے۔ لہٰذا قرآنِ پاک میں

ارشاد ہے:

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ (بقرہ - ۲۸۳) اور گواہی نہ چھپاؤ، جو کوئی گواہی چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے پیارے بندوں کی صفت قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ۔ (الفرقان - ۷۲) یعنی اللہ کے بندے جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی دینے سے یا خلافِ واقعہ بات کہنے سے شریعتِ اسلامی میں نہایت سختی سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کی سورۂ حج میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (حج - ۳۰)

بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی گواہی سے بچو (یہاں بت پرستی اور شرک کو ہم معنی کہا گیا ہے) صحیح بخاری و صحیح مسلم بلکہ دیگر کتبِ حدیث میں بھی سات مہلکات اور کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں پہلا گناہِ کبیرہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ دوسرا والدین کی نافرمانی، تیسرا قتل اور چوتھا گناہ جھوٹی گواہی دینا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ "جھوٹی گواہی دے کر آدمی پیچھے ہٹنے بھی نہیں پاتا کہ جہنم اس پر واجب ہو جاتی ہے"۔

شہادت کی مختلف اقسام حافظ ابنِ قیم نے اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" کے صفحہ ۲۴ پر "اَلْبَيِّنَةُ" (یعنی شہادت یا EVIDENCE) کی تعریف میں لکھا ہے۔ "شریعت میں "بَيِّنَة" سے مراد وہ چیز ہے جو حق کو واضح و ظاہر کر دے۔ یہ کبھی چار گواہوں کی ہوتی ہے، کبھی تین کی، کبھی دو کی اور کبھی صرف مرد یا ایک عورت کی، کبھی حلف اٹھانا یا اس سے انکار کرنا بھی شہادت کا ہم معنی ہو جاتا ہے، اور کبھی شہادۃ الحال (CIRCOMSTANCIAL EVIDENCE) کی دو قسمیں بھی ہو سکتی ہیں"۔

شہادت کے لیے شرائط گذشتہ بحث سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں گواہی دینا اور شہادت کا فریضہ ادا کرنا بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ یہ ہر انسان کا "حق" نہیں اور ہما و شما کا "حصہ" نہیں۔ بلکہ چند خاص معتبر اور متقی لوگوں کو ہی شہادت کے منصب پر فائز کیا جا سکتا ہے۔

خود قرآنِ پاک نے مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ (البقرہ ۔ ۲۸۲) کہہ کر اس کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے ۔ یعنی گواہ ۱ ۔ عاقل و بالغ ہو ۲ ۔ عادل ہو (عادل سے یہ مراد ہے کہ وہ راست باز اور راست رو ہو اور لوگوں کے درمیان قابلِ اعتبار سمجھا جائے)۔ ۳ ۔ اس کی بینائی صحیح سالم ہو اور اس نے واقعہ کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کیا ہو[1] ۴ ۔ اس کا حافظہ اور ضبط صحیح ہو کہ واقعہ کو جزئیات کے ساتھ یاد رکھ سکتا ہو ۔ ۵ ۔ آگے اس کو من و عن بیان کرنے پر بھی قادر ہو ۔

جو چیز دیکھنے کی ہو اُس کی عینی شہادت ضروری ہے جو بات سُننے کی ہو، اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ قول اس نے خود سُنا ہو اور قائل کو خود دیکھا ہو ۔ جس سے سُنا ہو اس کو اگر دیکھا نہ ہو، تو محض سُننے سے اس کے متعلق شہادت غیر مقبول ہو گی ۔ اسی طرح ریڈیو یا فون یا پردے کے پیچھے سے آواز پر شہادت کا اِطلاق نہیں کیا جا سکتا ، جب تک قاضی کے سامنے حاضر ہو کر گواہ بات نہ کرے اور قاضی اس کو خود نہ دیکھے ۔ اس کی شہادت غیر مقبول ہو گی ۔[2]

(باقی)

اصل بحث آئندہ قسط میں ملاحظہ فرمائیں ۔

---

[1] اسی اُصول پر گواہی میں سُنی ہوئی آواز یا گفتگو کو لانے والا بہرہ نہیں ہونا چاہیے ۔ (ف ۔ ر ۔ ص)

[2] آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ محض ایک تحریر کی کاپی یا اخباری کٹنگ کافی نہیں ہوتا ، بلکہ عدالت صاحبِ تحریر یا اخبار کے مدیر یا کالم نویس کو طلب کرتی ہے ۔ (ف ۔ ر ۔ ص)

اُستاذُ العُلماء ـــــ مولانا محمد چراغ کی یاد میں

جناب پروفیسر محمد اسلم اعوان

(۲)

مولانا محمد چراغ کا اصلی کارنامہ مولانا کے صاف ذہن اور انصاف پسند ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب انہیں مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں شرحِ صدر ہو گیا تو تمام مسلکانہ تعصبات اور اپنے طبقہ کے علماء کرام کی بے بناہ مخالفتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا علم و عمل تن من دھن کے ساتھ تحریکِ اسلامی کی معاونت کے لیے اقامتِ دین کی راہ میں لگا دیا ـــــ تحریکِ خلافت، کشمیر چھوڑ دو، احرار وغیرہ کی ہنگامی اور وقتی تحریکوں میں سرگرمِ عمل رہنے کے باوجود جب یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ اقامتِ دین اور حکومت و معاشرہ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مستقل بنیادوں پر کام کرنے والی اگر کوئی جماعت ہے تو وہ جماعتِ اسلامی ہے تو پھر اُنہوں نے بڑے بڑے جبہ و دستار رکھنے والے، گروہی مسلکانہ تعصبات کے علمبردار سکہ بند" اسماء گرامی" کے" اقوال و ملفوظات" کو نہیں، بلکہ ایک سچے حق پرست اور جراَت مند عالمِ دین کی طرح حق بات کو ترجیح دی۔ چنانچہ آپ نے زبانی گفتگوؤں، مکاتیب اور علماء کی مجالس میں خطابات کے دوران اکابر دیوبند قاری محمد طیب، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد علی جیسے علماء کے سامنے علمی میزان کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا کہ آپ مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی کی مخالفت کر کے زیادتی کر رہے ہیں۔ چنانچہ

ایسی ہی ایک محفل میں جو مدرسہ الاصلاح چنیوٹ میں علمائے کرام کے اجتماع میں جہاں آپ کو جماعتِ اسلامی پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا، حاضرین میں سے ایک عالمِ دین نے بے ساختہ انداز میں آپ سے پوچھ ہی لیا کہ مولانا! آپ مولانا مودودیؒ کے دفاع کے پیچھے اتنا کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کام میں کیوں اپنے آپ کو ہلکان کیے جا رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں بے ساختہ فرمایا۔ "مودودی اسلام کا خادم ہے، اور مظلوم ہے"۔ چنانچہ آپ کے عالمانہ دلائل، صاف گوئی اور دل سے نکلی ہوئی ان باتوں کا نتیجہ تھا کہ علمائے کرام کی ایک کثیر تعداد کے اذہان جماعتِ اسلامی اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں اشکال اور غلط فہمیوں سے صاف ہو گئے۔ لاتعداد علمائے کرام کو انھوں نے اس بات پر یکسو ہونے میں عملی رہنمائی فرمائی کہ عہدِ حاضر میں عصری تقاضوں کے مطابق اقامتِ دین کا کام صرف جماعتِ اسلامی کر رہی ہے۔

اسی سوزِ دروں کے پیشِ نظر جب آپ نے دیکھا کہ علمائے کرام کی اکثریت غلط فہمیوں کی بنا پر فروعی مسائل میں اُلجھ کر اپنی قوتوں کا ضیاع کر رہی ہے تو ۱۹۶۳ء میں، مولانا گلزار احمد مظاہری کے ساتھ مل کر جمعیت اتحاد العلماء کی بنیاد رکھی، جس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اسلامی انسائیکلوپیڈیا (شاہکار)، کا مضمون نگار لکھتا ہے:

"یہ ۱۹۶۳ء کے آخری ایام تھے۔ موسمِ سرما اپنے جوبن پر تھا۔ جب ملک کے ۷۲ منتخب علمائے کرام سٹیلائٹ ٹاؤن سرگودھا کے ایک مکان میں جمع ہوئے۔ ان سب حضرات کو مولانا گلزار احمد مظاہری نے اپنے یہاں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ یہ وہ دَور تھا جب سابق صدرِ پاکستان محمد ایوب خان مرحوم نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ عوام ان کی حکومت سے مطمئن نہیں۔ اور اپنے اقتدار کو مضبوط اور طویل بنانے کے لیے انھیں کچھ دوسرے ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جو ذرائع اختیار کیے ان میں سے ایک ذریعہ یہ تھا کہ قوم کو آپس میں مذہبی بنیادوں پر لڑا دیا جائے اور مُلکی نظم و نسق اور سیاسی مسائل پر ان کی توجہ کم سے کم ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ کچھ مذہبی راہنماؤں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، اور کچھ مخلص علماء جو حقائق

کے اس پس منظر سے ناواقف تھے، میدان میں اس لیے کود پڑے تھے کہ اگر مخالف گروہ کے سرگردہ لوگ ہمارے مسلک کے خلاف اس طرح کھل کر پروپیگنڈہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی اپنا موقف اسی آن بان اور اسی انداز میں عوام کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ صورتِ حال جب یہ ہو گئی تو مختلف اطراف سے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے طومار باندھے جانے لگے تو دردِ دل رکھنے والے علمائے کرام سے قوم کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اور کڑکڑاتی سردی کے دنوں میں وہ سرگودھا شہر میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ اُمت کے اس انتشار کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ تنظیم کے تحت کام کیا جائے۔ انفرادی کوششیں کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔ اس تنظیم کا نام جمعیت اتحاد العلماء رکھا گیا اور یہ نام اپنے مقاصد کی پوری پوری نشاندہی کر رہا تھا۔ امام المحدثین سید انور شاہ صاحب کاشمیری کے شاگرد رشید اور جامعہ عربیہ گوجرانوالہ کے بانی مولانا محمد چراغ صاحب اس تنظیم کے صدر، اشاعت العلوم لائل پور (حال فیصل آباد) کے شیخ الحدیث مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل نائب صدر اور مولانا گلزار احمد مظاہری اس تنظیم کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ (تنظیم کے صدر، نائب صدر اور ناظمِ اعلیٰ اب تینوں اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا چکے ہیں۔ لہٰذا ۱۹۷۶ء میں انسائیکلوپیڈیا کے لیے لکھی گئی مضمون نگار کی مندرجہ بالا سطر کو حذف کر دیا گیا ہے)۔

تنظیم کی سرپرستی کے لیے برصغیر کی عظیم اور اسم بامسمّٰی علمی شخصیت حضرت مولانا ولی اللہ صاحب (م ۱۹۷۳ء) کی خدمت میں درخواست کی گئی جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائی۔ اس تنظیم کی سرگرمیاں ملکی حالات کے ساتھ ساتھ تیز اور سست ہوتی رہی ہیں۔ تنظیم کے ناظمِ اعلیٰ مولانا گلزار احمد مظاہری نے مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کیا اور اتحادِ اُمت کی خاطر سعودی عرب کی نمایاں شخصیتوں کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔ پاکستان میں تحریک ختم نبوت (۱۹۷۴ء) جب اپنے عروج پر تھی تو مولانا گلزار احمد مظاہری اس وقت بھی بیرونِ ملک تھے۔ اس دوران وہ جہاں جہاں گئے انھوں نے وہاں کے رہنے والوں کو اس مسئلہ سے اچھی طرح روشناس کرایا۔ اور پاکستانی عوام کے اس ضمن میں مطالبات کے لیے زبردست تائید حاصل کی۔ ۱۹۷۵ء میں جمعیت اتحاد العلماء نے نفاذِ شریعت کے لیے

ایک ملک گیر مہم کا آغاز کیا۔

جمعیت اتحاد العلماء کے قابلِ ذکر کاموں میں سے ایک کام جو بڑی اہمیت کا حامل ہے وہ علماء اکیڈمی کا قیام ہے۔ علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فریضہ اقامتِ دین ایک بنیادی ذمہ داری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے طبقہ علماء کی اکثریت اس فریضے کی اہمیت اور اس کے عملی تقاضوں سے بے تعلق ہے۔ اس وجہ سے آج ہمارے ہاں دینی رہنمائی کے سرچشمے خشک ہو چکے ہیں۔ اور طبقہ علماء اپنے اندرونی اختلافات اور فروعی مسائل میں اُلجھ رہا ہے۔ اور اُمت کی رہنمائی کے منصب سے یکسر بے خبر ہے۔ جمعہ کے اجتماعات ایک رسم بن کر رہ گئے ہیں۔ اور لوگ وہاں سے فکرِ تازہ اور پیش آمدہ حالات پر تبصرہ اور کوئی رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے پرانے قصے اور دُور از کار داستانیں سن کے اُٹھ آتے ہیں۔ اِن حالات میں ضرورت ہے کہ علماء و ائمہ کا ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے جو دین کی حقیقی رُوح سے آشنا ہو، اپنی ذمہ داریاں سمجھتا ہو۔ اُمت کے حالات و معاملات پر اس کی نظر ہو۔ اور وہ اپنے سامعین اور مقتدی حضرات کو کوئی فکر اور جذبہ دے سکے۔ ایسے گروہ کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ آج دُنیا بھر میں مساجد کی تعداد لاکھوں ہے، لیکن ان میں سے بہت کم ایسی مساجد ہیں جن کو مرکزِ اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ مکہ مکرمہ کی "پیغام مسجد کانفرنس" میں بھی اس ضرورت کا احساس کیا گیا اور مساجد کو مراکز اسلام میں تبدیل کرنے کی عملی تدابیر طے کی گئیں۔ انہی مقاصد کے حصول کے لیے ایک عرصہ سے اہلِ فکر و نظر کے حلقہ میں تجاویز و مشورے ہو رہے تھے۔ چنانچہ جمعیت اتحاد العلماء کے اصحابِ علم و فضل نے اسے عملی شکل دے دی ہے اور علماء اکیڈمی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس میں باقاعدہ کلاسز کا اجرا ہو چکا ہے۔ علماء اکیڈمی نہ صرف علماءِ حق کا گروہ تیار کرے گی، بلکہ مساجد کے ذریعے اسلامی انقلاب لانے کی ایک تجربہ گاہ بھی ثابت ہو گی۔

علماء اکیڈمی ان مقاصد کو بروئے کار لائے گی جو درج ذیل ہیں:

— ایسے علماء اور ائمہ حضرات تیار کرنا جو فریضہ اقامتِ دین کا مکمل شعور رکھتے ہوں۔

— معاشرے میں حکیمانہ انداز میں اصلاح کا کام کر سکیں۔
— دورِ حاضر کے مسائل میں اسلام کو بہ حیثیت ایک رہنما قوت کے پیش کر سکیں۔
— اتنا علم رکھتے ہوں کہ عالمی تحریکات (عیسائیت، یہودیت، سرمایہ داری، سوشلزم کے علاوہ قادیانیت جیسے فتنوں) کا مقابلہ علمی استدلال سے کر سکیں۔
— قیامِ پاکستان کے محرکات سے بخوبی آگاہ ہوں۔
— اختلافی مسائل میں اُمت کو اُلجھانے کے بجائے اُسے قرآن و سنّت کی روشنی فراہم کریں۔
— اپنی مساجد یا دینی مراکز میں تحریکِ اسلامی کے بھرپور کارکن ہوں۔
— قرأت و تجوید کے اعلیٰ معیار پر پورا اُتر سکیں۔

چنانچہ اِن مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اکیڈمی میں تین شعبے قائم کیے گئے ہیں۔

۱— شعبۂ تربیت ائمہ و خطباء۔
۲— شعبۂ حفظ و قرأت۔
۳— شعبۂ تحقیق۔

یہ علما اکیڈمی لاہور سے تقریباً چھ میل دُور ملتان روڈ پر مرکز جماعتِ اسلامی منصورہ لاہور کے سامنے ایک قطعۂ اراضی اور ایک عمارت خرید کر اس میں قائم کی گئی ہے..... الخ۔

یہ مولانا محمد چراغ ہی کی شخصیت تھی کہ جس نے اکابر دیوبند کے بھاری بھرکم ناموں اور شخصیات سے مرعوب ہونے کے بجائے، علمائے کرام میں کُھل کر مولانا مودودی کے حقانی مسلک اور جماعتِ اسلامی کے موقف کی دل و جان سے تبلیغ و اشاعت کی — کیونکہ وہ اپنے شیخ انور شاہ کاشمیری کا یہ نکتہ پا گئے تھے کہ فقہی موشگافیوں میں پڑ کر ساری زندگی لڑنا اور ڈٹے رہنا عمرِ عزیز ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے مولانا محمد چراغ نے کسی مسلکانہ تعصب کے بغیر مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے طلبا کے لیے

(باقی بر صفحہ ۵۶)

قومیّت اور وطنیّت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

(۳)

مغربی استعمار کی ریشہ دوانیاں اصل بات یہ ہے کہ گذشتہ تین صدیوں سے یورپی اقوام نے ساری دنیا میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔ دنیا جہاں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنا گھر بھر لیا۔ اپنے ملک میں صنعت و حرفت کے کارخانے لگا لیے۔ اپنے لوگوں کو آسودہ حال اور خوشحال بنا لیا۔ دوسری جانب تیسری دنیا کے ملکوں کو مفلس و قلاش جاہل و ناخواندہ بنا دیا۔ ان کے اندر قائم صنعتیں تباہ کر ڈالیں۔ ان کے تہذیبی ادارے برباد کر دیئے، ان کو پس ماندہ اور ناکارہ بنا ڈالا۔

اس پس منظر میں اس بات کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ انتشار و افتراق کی قوتیں مغربی ممالک میں کیوں دبی ہوئی ہیں۔ اور مشرقی ممالک میں کیوں خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ مغربی ممالک باہمی حریفانہ کشمکش کے دور سے گذر چکے ہیں۔ اب بڑی حد تک یہ ایک دوسرے کا لحاظ کرتے ہیں۔ اب تو یہ تیسری دنیا کے ابھرتے ہوئے ممالک کو اپنا حریف اور رقیب سمجھتے ہیں۔ اور اس حریف کے خلاف بڑی حد تک باہمی مفاہمت پر عمل پیرا ہیں کہ کسی بھی طرح ان کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ بلا شبہ تیسری دنیا کے ممالک کے اپنے حالات بھی ناگفتہ بہ ہیں۔ تعلیمی پستی، معاشی بدحالی، معاشرتی کشاکش، سیاسی عدم استحکام جیسے نقائص عام ہیں۔ پھر منچلوں اور مستبدوں کا دور بھی جاری ہے۔ فوجی انقلابات

بھی آتے رہتے ہیں۔ جمہوری حکومتوں کا حال بھی یہ ہے کہ:

ع آں چہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

لیکن تیسری دُنیا کی خرابیوں، ناکامیوں، بدعنوانیوں کی اگر سراغ رسانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ استعماری قوتیں، بڑی طاقتیں، دنیا کے چودھری کی پسِ پردہ ریشہ دوانیوں کے یہ سب نتائج ہیں۔ ان کی خواہش یہ رہتی ہے کہ مچھلی خواہ کتنی ہی تڑپا کرے مگر رہے ہمارے جال کے اندر۔ اپنے زیر اثر مُلکوں میں حکومتوں کو وہ اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر کوئی حکومت سرکشی دکھلائے تو اُس کے مُلک میں کسی بھی لِسانی یا نسلی اقلیت کو بھڑکا کر فتنہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ افلاس زدہ اور کم تعلیم یافتہ ممالک کے اندر آلۂ کار افراد کو خرید لینا کچھ دشوار کام نہیں ہے۔ دُنیا کے چودھری ان ممالک میں موجود لسانی یا نسلی اقلیتوں کی عصبیتوں کو اور دوسرے فروق و اختلافات کو بھڑکاتے رہتے ہیں۔ لِسانی اور نسلی اقلیتیں موجودہ دُنیا کے سارے ممالک میں ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں ان کو استعمال کرتے ہیں اور جہاں نہیں چاہتے وہاں استعمال نہیں کرتے۔

عرب خلافتِ عثمانیہ کے زیر سایہ صدیوں سے رہتے چلے آتے تھے۔ استعماری قوتوں نے عربوں کو ورغلایا۔ ایک وسیع و عریض عرب مملکت کا لالچ دیا۔ ان کو ترکوں سے لڑا دیا۔ اور خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے کر ڈالے۔ عربوں کی متحدہ ریاست تو کجا عثمانی دور کے صرف ایک صوبے شام کے پانچ ٹکڑے کر ڈالے۔

۱۔ شام ۲۔ لبنان ۳۔ اُردن ۴۔ اسرائیل ۵۔ سنجق انطاکیہ

چار آزاد ممالک ہیں۔ سنجق واپس ترکیہ کو دے دیا۔ اول تین کیا عرب نہیں؟ کیا ان میں وحدتِ نسل، وحدتِ لسان اور وحدتِ تاریخ، وحدتِ مذہب موجود نہیں ہے؟ سب کچھ ہے۔ مگر استعماری قوتوں کا مفاد ان کو ٹکڑے ٹکڑے بنا دینے میں ہے۔ شمالی یمن اور جنوبی یمن، شمالی کوریا اور جنوبی کوریا، مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کو دُنیا کے چودھریوں نے جدا جدا مملکتیں بنا رکھا ہے۔ حالانکہ ان کے اندر وحدتِ کاملہ پائی جاتی ہے اور ابھی کل تک یہ سب ایک ہی مُلک تھے۔

دوسری طرف چین کے زرد خطرہ کے پیش نظر دُنیا کے ان چودھریوں کا مفاد اس میں تھا اور ابھی بھی ہے کہ ہندوستان کو مستحکم رکھا جائے۔ ایک طاقت ور ریاست بنا دیا جائے۔ اس لیے ہزار اسبابِ انتشار و افتراق اور اقلیتوں میں شدید اضطراب کے باوجود نہرو کی چابک دستی نے انتشار کی قوتوں کو بڑھنے نہیں دیا۔ کوئی علاقہ مرکز سے بالکلیہ علیحدہ نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دُنیا زیادہ امن و سکون سے وقت گزار سکے اگر کسی طرح سے دُنیا والوں کو ان چودھریوں کی ریشہ دوانیوں سے نجات مل جائے۔ کسی طرح اُن کی دخل اندازی کا خاتمہ ہو جائے۔

مسئلہ قومیت کا علمی تجزیہ

مغرب اور مشرق میں وطنیت اور قومیت کی وسعت اور کارگزاری کا مختصر سا تذکرہ صفحاتِ بالا میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب ہم قومیت کے اہداف اور غایات کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ وہ کس حد تک پورے ہوئے۔ اب ذرا خالص علمی انداز میں اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیا قوم پرستی، وطن پرستی، لسان پرستی اختیار کرنے سے نوعِ انسانی کا بنیادی مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ یا حل ہو سکتا ہے؟ کیا یہ نظریات انسان کو عدل و انصاف کا معاشرہ اور امن و سکون کا ماحول مہیا کر سکتے ہیں؟

بحث و مناظرہ کا طریقۂ کار ترک کر کے، تمام زوائد و عوارض سے عاری کر کے ہم اِن نظریات کے مطابق ایک مثالی معاشرہ کا تصور کرتے ہیں۔ ہم ایک ایسا جزیرہ فرض کر لیتے ہیں جہاں ایک ہی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جہاں صرف ایک زبان بولنے والے افراد آباد ہیں، سب ایک ہی بولی میں بات کرتے ہیں، دوسرا کوئی فرق ان کے درمیان نہیں مزید برآں ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں کامل مساوات قائم ہے۔ ہر شخص کے پاس کاشت کرنے کے لیے پانچ ایکڑ زمین موجود ہے، ہر شخص کے پاس دودھ پینے کے لیے ایک گائے موجود ہے۔ رہنے کے لیے ہر شخص کے پاس ایک آرام دہ مکان موجود ہے۔ ہر شخص کے بیوی بچے ہیں۔ راحت، سکون اور طمانیت کے لیے تمام ضروری سامان موجود ہے۔ کوئی غیر قوم، غیر زبان، غیر ملکی وہاں موجود نہیں ہے۔ ظلم و زیادتی، انتشار و افتراق اور استحصال کے تمام عوامل وہاں مفقود

ہیں۔ وہاں کامل مساوات ہے، ہر طرح راحت و آرام اور عیش و سکون ہے۔ یہ جزیرہ قومیت، وطنیت، لسانیت اور اشتراکیت کے پرستاروں کے تصورات کے مطابق جنت کا نمونہ ہے۔ اس سے برتر اور افضل زندگی کا کوئی تصور وہ پیش نہیں کرسکتے۔

وہاں رہتے رہتے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ پریشانی، بدامنی اور بدعنوانیوں کی وہ ساری خرابیاں بھی وہاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں جن کو چھوڑ کر اس جزیرہ میں نئی دُنیا آباد کی تھی۔ ہوا یوں کہ ایک شخص نے دل میں سوچا کہ میرے پڑوسی کی زمین زیادہ زرخیز ہے اس کو کسی طرح حاصل کرنا چاہیے۔ اس نے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے پڑوسی کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ ان دونوں کے درمیان جھگڑا رہنے لگا۔ ایک اور شخص نے سوچا کہ میری گائے دُودھ کم دیتی ہے۔ میرے پڑوسی کی گائے زیادہ دُودھ دینے والی ہے۔ کسی طرح اس کو حاصل کرنا چاہیے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں وہ لگ گیا۔ ایک تیسرے شخص نے سوچا کہ فلاں شخص کی عورت خوبصورت بھی ہے اور سلیقہ مند بھی ہے۔ میری بیوی نہ اتنی حسین ہے نہ اس قدر سلیقہ مند ہے۔ کسی طرح اس عورت کو حاصل کرنا چاہیے۔ مسائل کھڑے ہوگئے۔ دوسرے مرحلہ پر دھونس، دھاندلی اور زیادتی کے واقعات رونما ہونے لگے۔ مقدمہ بازی شروع ہوگئی۔ پھر سازشی مرحلہ شروع ہوا۔ پولیس کو رشوت دے کر ہموار کیا گیا۔ اس طرح اس جزیرہ میں دھیرے دھیرے چوری، اغوا، لڑائی، قتل، رشوت، دھوکہ بازی تمام بُرائیاں پیدا ہوگئیں۔ اس کا حال بھی ویسا ہی ہوگیا جیسا کہ دُنیا کے دوسرے علاقوں کا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خرابیوں کی جڑ انسان کے باطن میں ہے۔ خارج میں نہیں ہے۔ شیطان باطن میں انسان کو ورغلاتا ہے۔ جس کے بعد انسان غلط راہ پر، مجرمانہ راہ پر چل پڑتا ہے۔ اور وہاں شر اور بُرائی، فتنہ و فساد کی فصل پک کر تیار ہوجاتی ہے۔ یہاں غورطلب مسئلہ یہ ہے کہ شر و فساد کے اس سرچشمے کو کیا قومیت، وطنیت، اشتراکیت یا کسی اور خارجی طریقہ سے ختم کیا جاسکتا ہے؟ کیا پھوڑے پھنسیوں کے علاج کے لیے خارج میں پھاہا رکھ دینا کافی ہے۔ ؟ کیا فساد خون دُور کرنے کے لیے اندرونی علاج

کی ضرورت نہیں ہے؟

مذہب کا انکار کر دینے کے بعد یورپ غلط راستہ پر پڑ گیا۔ اُس نے داخلیت کا انکار کر دیا اور خارجیت کی راہ پر چل پڑا۔ حالانکہ شر کی جڑ جب باطن میں موجود ہے، خارج میں دوا دارو سے مرض کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ پولیس ہو، فوج ہو، انتظامیہ ہو، وزراء ہوں سب اسی معاشرہ کے افراد ہوتے ہیں۔ وہ کوئی فرشتے نہیں ہوتے۔ شر پسندوں اور اغراض مندوں کے لیے ان کو اپنے حق میں ہموار کر لینا کوئی دشوار بات نہیں ہے۔ روپیہ، عورت اور شراب کی صورت میں رشوت دے کر شر پسند لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اور حکومت کرنے والے وزراء کو اپنے حق میں ہموار کر لیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے؟ اس لیے قومیت ہو، وطنیت ہو، اشتراکیت ہو، ان میں سے کوئی بھی شر کے منبع اور سرچشمہ پر حملہ آور نہیں ہوتا۔ اس لیے معاشرے سے شر دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ یہ انسان کو عدل دے سکتے ہیں، نہ یہ انسان کو امن و سکون دے سکتے ہیں۔

شر کی جڑ اُکھاڑنے کے لیے انسان کے اندر کی اصلاح، انسان کے باطن کی تطہیر اور انسان کے ضمیر کا تزکیہ کرنا ضروری ہے۔ یہ وہ دائرہ ہے جہاں مغرب اپنی تمام تر تابناکیوں کے باوجود، داخل ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے مغرب نے جتنے بھی نظام پیش کیے ہیں وہ انسانوں کو کچھ عرصہ بہلا تو سکتے ہیں لیکن انسانیت کا کوئی ایک مسئلہ بھی مستقل طور پر حل نہیں کر سکتے ہیں۔ یہاں صرف اسلام کامیاب و کارگر ہے۔ جاہلیت عرب کے انتہائی پست اور بگڑے ہوئے معاشرے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو عشروں کی مدت میں صالح بلکہ مصلح بنا دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

مسلمان عورت کا غیر محرم مرد سے مصافحہ؟

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال :- روزنامہ مساوات ۴؍ جون ۱۹۸۹ء میں ایک مضمون "علامہ" کریم احمد کے نام سے چھپا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض نیم تعلیم یافتہ علماء نے بے نظیر کے بعض امریکی کانگریس کے ارکان سے ہاتھ ملانے کو خلافِ اسلام قرار دیا ہے، حالانکہ مودودیؒ صاحب نے تفہیم القرآن جلد ۵، ص ۴۴۵، ۵۰۴ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر عورتوں سے ہاتھ ملایا۔ الجامع لاحکام القرآن علامہ قرطبی جلد ۸ ص ۷۱ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو قائم مقام بنایا کہ وہ عورتوں سے مصافحہ کریں۔ اور ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ نے خود عورتوں سے مصافحہ فرمایا۔ علامہ قرطبی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب نے اپنے ایک خط میں علامہ قرطبی کے حوالے سے یہی بات کہی ہے۔ یہ خط پاکستان ٹائمز لاہور مورخہ ۱۵؍ جون میں چھپا ہے۔ آپ براہ کرم صحیح صورتِ حال واضح کریں کہ یہ حوالے کہاں تک صحیح ہیں اور عورت کا غیر محرم مرد سے مصافحہ کہاں تک جائز ہے؟

جواب :- آپ نے جن مضامین اور تفاسیر کا ذکر اپنے سوال میں کیا ہے، میں نے سب کا بغور مطالعہ کیا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ پروفیسر رفیع اللہ شہاب صاحب اور

مساوات کے مضمون نگار نے صریح دجل و تلبیس سے کام لیتے ہوئے امام قرطبی اور مولانا مودودیؒ کے موقف کو بالکل غلط اور تحریف شدہ صورت میں پیش کیا ہے۔ جس بات کا جتنا حصہ اپنے مطلب کا نظر آیا، اُسے لے لیا۔ اور جو اُن کے خلاف پڑتا تھا، اُسے حذف کر دیا ہے۔ پہلے میں علامہ قرطبی کی تفسیر کو لیتا ہوں۔ انھوں نے سورۃ الممتحنہ کی آیت نمبر ۱۲ کے تحت یہ بحث کی ہے جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ اگر مومن خواتین بیعت کے لیے حاضر ہوں تو اُن سے بیعت کیسے لی جائے۔ امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب مومن عورتیں ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی تھیں تو آپ اُن سے ان باتوں کا عہد و اقرار لیتے تھے جو اس آیت میں مذکور ہیں (کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی......) اس کے بعد علامہ قرطبی نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقررن بذلک من قولھن قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انطلقن، فقد بایعتکنّ، ولا واللہ ما مسّت یدُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ید امراۃٍ قطّ، غیر انہ بایعھن بالکلام وما مست کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کف امراۃ قطّ وکان یقول لھن اذا اُخذ علیھنّ: قد بایعتکن کلامًا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مومنات سے زبانی اقرار کرا لیتے تھے تو آنحضورؐ فرماتے تھے: چلی جاؤ: بس میں نے تم سے بیعت لے لی۔ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے کسی بیعت کرنے والی خاتون کا ہاتھ مس نہیں فرمایا، الا یہ کہ بس کلام کے ذریعے ان سے بیعت لیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی نے کسی عورت کی ہتھیلی کو نہیں چھوا، ان سے بیعت لیتے وقت فرماتے تھے: میں نے تم سے زبانی بیعت لے لی"۔

اب ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے کہ یہ صحیح الاسناد حدیث جو حضرت عائشہ صدیقہ زوجہ مطہرہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے، جسے مفسر قرطبی نے سب سے پہلے نقل کیا ہے اور جس میں اُم المومنین اللہ کی قسم کھا کر فرما رہی ہیں کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم بالمشافہ قولی بیعت لے کر صحابیات کو چلے جانے کا حکم دیتے تھے اس پوری حدیث سے تو رفیع اللہ صاحب اور مساوات کے "علامہ" نے آنکھیں میچ لی ہیں اور اس کے بعد امام قرطبی کی ایک روایت دے دی ہے، جس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کوہ صفا پر جب خواتین سے بیعت لی گئی تو حضرت عمرؓ کو درمیان میں واسطہ بنایا گیا اور وہ خواتین سے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نائب یا نمائندہ بن کر بیعت کے لیے مصافحہ کرتے تھے۔ اس روایت کا مفہوم اگر یہ لیا جائے کہ حضرت عمرؓ خواتین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بیعت کرتے تھے اور آنحضورؐ نے انہیں ایسا کرنے پر مامور فرمایا تھا تو یہ روایت کسی طرح بھی قابلِ تسلیم نہیں ہو سکتی۔ اس کے وجوہ مختصراً درج ذیل ہیں:

اِس روایت کو امام قرطبی نے قیل کے لفظ سے شروع کیا ہے اور قیل کو علما صیغہ تمریض کا نام دیتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ قول اہلِ علم کے نزدیک مستند اور قابلِ قبول نہیں۔ لیکن تفاسیر اور قدیم تصانیف میں چونکہ ہر طرح کے قول کا احاطہ کر دیا جاتا ہے، اِس لیے ایسے کمزور اور شاذ اقوال بھی درج ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ والی روایت کے ساتھ قرطبی نے ایک دوسری روایت بھی دی ہے، جس میں حضرت عمرؓ کے بجائے کسی عورت کا ذکر ہے جس کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ (روی انہ کلف امرأۃ وقفت علی الصفا) اس پر مفسر قرطبی کا اپنا ریمارک یہ ہے: ذالک ضعیف، انما ینبغی التعویل علی ما فی الصحیح (یہ بات کمزور ہے۔ اصل اعتماد و اعتبار اس قول پر ہونا چاہیے جو حدیثِ صحیح میں وارد ہے جس میں بیعت کے لیے کسی درمیانی واسطہ و وسیلہ کا ذکر موجود نہیں)۔ امام قرطبی کی یہ رائے جو میں نے ابھی ترجمے کے ساتھ نقل کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اس روایت کی صحت میں کلام ہے جس میں حضرت عمرؓ کا خواتین سے بیعت لینا اور مصافحہ کرنا بیان ہوا ہے، اور مساوات کے مقالہ نگار کی

یہ بات بالکل غلط ہے کہ "علامہ قرطبی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے"۔

مولانا مودودیؒ اور اُن کی تفسیر "تفہیم القرآن" کے حوالے سے یہ قول نقل کرنا بھی تحریف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عمرؓ نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ تفہیم القرآن جلد پنجم ص ۴۹۴ حاشیہ ۲۳ پر مولانا مرحوم فرماتے ہیں:

"عورتوں سے بیعت لیتے وقت آپؐ نے کبھی کسی عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں لیا، بلکہ مختلف دوسرے طریقے اختیار فرمائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: خدا کی قسم، بیعت میں حضورؐ کا ہاتھ کبھی کسی عورت کے ہاتھ سے چھوا تک نہیں ہے۔ آپ عورتوں سے بیعت لیتے ہوئے "زبان مبارک سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تجھ سے بیعت لی"۔ (بخاری)۔ اُمیمہ بنت رُقیقہ کا بیان ہے کہ میں اور چند عورتیں حضورؐ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے قرآن کی آیت[۱۱] سورۃ الممتحنہ کے مطابق ہم سے عہد لیا۔ پھر ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہاتھ بڑھایئے، تاکہ ہم آپؐ سے بیعت کریں۔ آپؐ نے فرمایا: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ آپؐ نے ہم میں کسی عورت سے بھی مصافحہ نہیں کیا (مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)۔ ابوداؤد نے مراسیل میں شعبی کی روایت نقل کی ہے کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت ایک چادر حضورؐ کی طرف بڑھائی گئی۔ آپؐ نے بس اُسے ہاتھ میں لے لیا۔ اور فرمایا: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ ابن اسحاق نے مغازی میں اَبان بن صالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ پانی کے ایک برتن میں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور پھر عورت اسی برتن میں اپنا ہاتھ ڈال دیتی تھی"۔

آخر میں صاحبِ تفہیم نے لکھا ہے:

"ایک روایت میں اُمِ عطیہ انصاریہ کا یہ بیان ملتا ہے کہ حضورؐ نے گھر کے باہر سے ہاتھ بڑھایا اور ہم نے اندر سے ہاتھ بڑھائے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عورتوں نے آپؐ سے مصافحہ بھی کیا ہو۔ کیونکہ حضرت اُمِ عطیہ نے مصافحہ کی تصریح نہیں کی ہے۔ غالباً اس موقع پر صورت یہ رہی ہو گی کہ عہد لیتے

وقت آپؐ نے باہر سے ہاتھ بڑھایا ہو گا اور اندر سے عورتوں نے اپنے ہاتھ بڑھا دیے ہوں گے بغیر اس کے کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ آپؐ کے ہاتھ سے مس ہو۔"

تفہیم القرآن کا حاشیہ اور بالخصوص حاشیے کا آخری حصہ اپنے مدعا و منشا میں بالکل واضح ہے۔ لیکن اس پر بھی کریم احمد صاحب کا مضحکہ خیز تبصرہ یہ ہے کہ "ظاہر ہے کہ ہاتھ یا تو مصافحہ کے لیے بڑھائے جاتے ہیں یا مارنے کے لیے۔ یہاں مارنے والا قرینہ ہے نہیں، تو مصافحہ والا ہی قرینہ ہو سکتا ہے"۔ حالانکہ آنحضورؐ اگر بیعت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے دستِ مبارک کو متحرک فرما رہے ہوں اور خواتین جن سے بیعت لی جا رہی ہے وہ بھی اپنے ہاتھ بڑھا یا اُٹھا کر بیعت کے الفاظ ادا کر رہی ہوں، خواتین مکان یا احاطے کے اندر ہوں اور آنحضورؐ خارج میں تشریف فرما ہوں تو اس میں کونسا امر خلاف قرینہ و قیاس ہے اور جہاں تک باہمی مصافحہ کا تعلق ہے، وہ اس لیے غیر ممکن و محال ہے کہ دوسری احادیثِ صحیحہ میں یہ قطعی صراحت وارد ہے کہ آنحضورؐ نے بیعت کے موقع پر کبھی بھی کسی خاتون کا ہاتھ نہیں چھوا۔ اس کے باوجود عورت اور غیر محرم مرد کے مصافحہ و مکالمہ کا جواز ایسی روایات سے فراہم کرنا نری ہٹ دھرمی اور فتنہ پردازی کے سوا اور کیا ہے؟

مطبوعات

عبرت نامۂ سمرقند | از نصیر بائی بخاری - ترتیب و تدوین : ڈاکٹر لعل بہا صاحب صدر شعبۂ تاریخ و ڈاکٹر محمد ساعد صاحب صدر شعبۂ جغرافیہ (پشاور یونیورسٹی) - باہتمام : انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز پشاور - ناشر : ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور (کوڈ نمبر ۵۴۵۷۰) دبیز سفید کاغذ، اعلیٰ طباعت، رنگین سرورق، دبیز آرٹ پیپر - صفحات : ۲۰۸
قیمت : ۴۲/- روپے -

قطرہ ہائے خونِ جگر سے لکھی ہوئی یہ کتاب شاید اشک آلود آنکھوں کے ساتھ ہی پڑھی جائے گی۔ "صبح بخارا" (JOSHUA KUNITZ) کی کتاب پڑھنے کے بعد اس کتاب نے نئے اور تفصیلی احوال بے نقاب کئے - وہ میدانِ جنگ سے باہر کے ایک مخالفِ اسلام یہودی کا تبصرہ تھا جس کے بیان کا جھکاؤ فاتحین کی جانب تھا۔ یہ کتاب خود مفتوحین کا جوابِ دعویٰ بھی ہے، اپنے اُوپر تبصرہ بھی، اور نوحہ بھی۔

اِسے پڑھتے ہوئے میرے ذہن کے سامنے تاریخ کا سارا فلم گھومنے لگا اور میں نے دیکھا کہ جدید دَورِ الحاد کی اُٹھائی ہوئی سامراجی طاقتوں سے زیادہ ظالم طاقت شاید چنگیز و ہلاکو کو بھی ثابت نہ کیا جا سکے۔ اور دوسری طرف مَیں نے دیکھا کہ اندلس میں، بربر میں، ارضِ فلسطین میں، ترکیہ میں، سرزمینِ عرب کے مختلف گوشوں میں، اور برصغیر میں ہر جگہ اس طوفانِ بلا کا خون کے آخری قطرے تک مقابلہ کرنے والی قوم صرف قومِ محمدیؐ تھی - باقی سب نے سر جھکا دیئے اور فاتحین سے سودے چکا کر ان کے ہاتھوں کی تلواریں بن گئے - مسلمانوں نے سر جھکانے کے بجائے بلا لحاظ اس کے کہ سر کٹانے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے - ان کا ایمان ظلم کے آگے جھکنے کا روادار

نہیں تھا۔ اور پھر مجھے یہ دردناک احساس بھی ہوا کہ تقریباً ہر جگہ ہماری شکست کا سبب ہمارے ملّاں کے ضمیر فروش ہی تھے۔ ہمیں شمشیر کہیں بھی نہ جھکا سکی، تو ز ویر مار گئی۔

آپ کتاب کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنا چاہیں تو "مقدمہ" ملاحظہ فرمالیں ــ بخارا کا رقبہ ۲۲۴۰۰۰ مربع کلومیٹر اور آبادی ۴۰ لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس سلطنت کو نہایت خطرناک حالات میں امیر بخارا، اس کے علماء اور سرداروں اور لشکریوں اور عوام نے بہت دیر تک دشمن کا لقمہ بننے سے روکے رکھا۔ تاشقند میں سُرخ جھنڈا ۱۹۱۷ء (ستمبر اکتوبر) میں لہرا دیا گیا۔ ۱۹ فروری ۱۹۱۸ء کو قوقند حکومت ختم ہوگئی اور ایک رُوسی رپورٹ میں اسے مُردہ شہر کہا گیا۔ یہیں سے سماجی تحریک (دراصل تحریک عربیت پسنداں) شروع ہوئی۔

پھر مسلمانوں کے اندر احمق دانشوروں اور جدیدیوں نے کالی سوف (فاتح قوقند) کو بخارا پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۱۸ء کو جنگی کارروائی کا گولہ بخارا کے سر پر پھٹا۔ یہ سب کچھ فرقہ منورین، عظیم ترکستان کے علمبردار جدیدیوں اور فرقہ ریاش بخارا کا کیا دھرا تھا۔ واللہ! جس شان سے شکست کے محاذ پہ کھڑے ہو کر بخارا والوں نے فاتح ظالم کی مزاحمت کی ہے اُس کی کوئی مثال سوائے افغانستان کے نہ ملے گی۔ یہ ہے وہ فنڈامنٹلزم جس سے مغرب پر کپکپی طاری ہوتی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سچّے اُمتی جان کی بازی ہارتے ہوئے ایسی ایسی کاری ضربیں دشمن کو لگاتے ہیں کہ کسی دوسری قوم کے پاس جواب نہیں! مزاحمت کا ایک ذرا سا منظر ص ۱۱۰ پر ملاحظہ فرمایئے۔ ص ۱۳۳، ۱۳۴ بھی دیکھیے۔ ۲ دسمبر ۱۹۲۰ء کو سقوطِ بخارا ہوا۔ پھر جو قتلِ عام ہوا، علماء اکابر کا جس طرح خون بہایا گیا، مسجدیں اور مدرسے تباہ کیے گئے۔ کتب خانے جلائے گئے، مُسلم عورتوں کے نقاب جبراً نوچے گئے، یہ داستانیں پڑھیے۔ کتنا شدید انتقامی تعصب ہے۔ غیر مُسلموں خصوصاً ملحدوں کو مسلمانوں کے خلاف ــ کہ یہ دلیری سے ہمارا مقابلہ کیوں کرتے ہیں۔

اور یاد رکھیے کہ افغانستان میں بھی ایسے سازشی کام کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی ایسے جدیدیے اور منورین خیالات و نظریات کے جال مکڑیوں کی طرح پھیلا رہے ہیں کہ اگر آپ

نے ہوش سے کام نہ لیا، بلکہ اگر افغانستان کو نہ بچایا (جیسے تاشقند کو پہلے ہڑپ کیا گیا تھا) تو آپ اپنے آپ کو بخارا کے انجام سے نہیں بچا سکتے۔

تاریخ نے پاس ہی نصف صدی پہلے آپ کے لیے درسِ عبرت لکھ کر افق پر آویزاں کر دیا ہے۔ چاہیں تو پڑھ کر سبق لیں اور چاہیں تو دانشورانہ حماقتوں کے دو جام اور چڑھا کر وقت کی تلوار اور واقعات و احوال کے اسلحہ کو دوسروں کے لیے چھوڑ دیں جنھیں قدرت نے آپ کی سزا کے لیے مقرر کر رکھا ہو گا۔

علمائے احناف کے حیرت انگیز واقعات | تالیف: مولانا عبدالقیوم حقانی۔ ناشر: موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ۔ ملنے کے کئی پتوں میں سے لاہور کا ایک پتہ: مکتبہ مدنیہ، ۱۷-اردو بازار، لاہور۔ سفید کاغذ، مناسب کتابت و طباعت، جلد مضبوط مع سنہری ڈائی و حاشیہ۔ صفحات: ۲۷۶۔ قیمت: ۵۱/ روپے۔

اس کتاب کی جلد اوّل پہلے شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے سوانح اور علمی فضائل اور تدریسی اور فقہی کمالات کا ذکر ہے۔ اب اس دوسری جلد میں امام عالی مقام کے دو نامور شاگردوں کا تفصیلی بیان ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے اپنے استاد سے ۱۷ سال تعلیم پائی۔ اور ۱۷ ہی سال تک منصبِ قضا پر کام کیا۔ جملہ ۴۰ مشائخ و اساتذہ سے استفادہ کیا۔ اوّل درجے کے ایک سو قوی الحافظہ لوگوں میں شمار ہوتے۔ ۴۰ یا زائد حدیثیں ایک ہی سماعت کے بعد فوراً سنا دیتے۔ غریبی کی وجہ سے حصولِ تعلیم کے لیے سسرالی مکان کے شہتیر بیچ ڈالے۔ کاغذ نہ خرید سکتے تو جانوروں کی ہڈیوں اور پسلیوں پر لکھتے۔ اہل و عیال نے فاقہ و عسرت کا لمبا دور گزارا۔ صاحبزادے کے انتقال اور والد کے جنازے میں نہ شریک ہو سکے۔ فرمایا: میری بات دلیل و حجت کے بغیر نہ ماننا۔ بادشاہ کے سامنے اپنے علم، اپنے ایمان اور عہدۂ قضا کی آبرو کا خوب تحفظ کیا۔

اسی طرح امام محمدؒ کی شخصیت بڑی گراں بہا ہے۔ ایک ہفتہ میں قرآن حکیم کا حفظ (استحضار پہلے غالباً جستہ جستہ بڑے حصے یاد تھے، درمیانی خلا پُر کر لیے)۔ امام کسائی سے تبادلۂ خیال، امام مالکؒ سے استفادہ اور ایک مباحثہ، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا موازنہ، کتاب الحجج کی تیاری، اس سے امام شافعیؒ کا تاثر، اسد بن فرات کا استفادہ اور مباحث، یہ وضاحت کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا اختلاف صرف ۳۲ مسائل میں ہے۔ امام شافعیؒ سے تعلقِ خاطر اور ان پر خاص نظر، دربار میں امام شافعیؒ کی جان بخشی کرانے کا واقعہ، امام شافعیؒ کو امام محمدؒ سے استفادہ پر فخر تھا۔ "معاہدہ امن" کے سلسلے میں تنی ہوئی تلوار کے سامنے بادشاہ کی رائے کے خلاف امام محمدؒ کی حق گوئی، شاہی عتاب، امام کا فتویٰ کہ خلفائے راشدین کی دی ہوئی امان واپس نہیں لی جاسکتی، اسی عالم میں بادشاہ کی طرف سے قاضی القضاۃ کے عہدے کی پیش کش۔ امام شافعیؒ کا یہ ارشاد کہ میں نے امام محمدؒ جیسا ناسخ و منسوخ اور حلال و حرام اور ان کی علتوں کا جاننے والا نہیں پایا ۔۔۔ یہ چند جھلکیاں ہیں جن سے آپ امام محمدؒ کا مرتبہ معلوم کرسکتے ہیں۔

حیران ہوں کہ ایسے پایہ و معیار کے اُستاد اور شاگرد اب کتنے کم یاب بلکہ نایاب ہیں۔

میں چونکہ پہلے سے خاندانی تعلیم و معمولات کی وجہ سے فقہ حنفی سے منسوسل رہا ہوں اور فقہ کی ضرورت کو بھی سمجھتا ہوں اور اہل میں وجوہِ اختلاف کو بھی جانتا ہوں اس لیے ائمہ کے متعلق میری رائے کبھی بھی غیر محتاط نہیں رہی۔ حتیٰ کہ غیر حنفی ائمہ کو بھی اپنا سرتاج اور سرچشمۂ علم و ہدایت مانتا ہوں۔ لیکن اس کتاب کی مدد سے مجھے فقہ کے خلاف اِس دور کے دین گریز لوگوں کے پروپیگنڈے کی لایعنیت اور بھی اچھی طرح معلوم ہوئی۔ اِسی طرح ہمارے بعض وہابی دوست جب یک دم ایک تُرش ائمہ حنفیہ کی خدمات پر پھیر دیتے ہیں تو ان کو یہ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ حضرت اکابر احادیث کے پابند اور متلاشی اور اُن کی چھانٹ پرکھ کرنے کے علاوہ تفقہ کے ساتھ اُن سے اخذِ احکام کرتے تھے۔ راقم حنفی ہی نہیں، اہل حدیث کا بھی ساتھی ہے۔ مگر اس معنی میں کہ بہت سی احادیث کے سندی ضعف و مضبوطی کے ساتھ دِرایتی پرکھ بھی

ضروری ہوتی ہے اور احادیث کے معنی ڈکشنری ہی سے نہیں، صحابہ کی پوری جماعت شاگردانِ رسول پاکؐ کے معمولات کے ذریعے بھی ہوتی ہے کہ کن چیزوں کو حضورؐ نے دیکھ کر پسند کیا یا منع نہیں فرمایا۔

بہرحال آپ قرآن و سنت کے بعد فقہ کو مانیں نہ مانیں، خصوصاً فقہ حنفیہ سے آپ کو کدہو ہوا کرے۔ لیکن مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی زیرِنظر کتاب کو ضرور پڑھ لیں جو در حقیقت ائمہ کے بسیط احوال و مقامات کی محض تلخیص ہے۔

بزمِ اقبال کی ۳ تازہ کتب "بزمِ اقبال" حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، فکر اور شاعری پر مسلسل اور نوبہ نو کام کرنے کی وجہ سے شہرت رکھنے والا ادارہ ہے۔ حال ہی میں اِس ادارہ نے ۳ کتابیں شائع کی ہیں:

۱۔ اقبال شناسی اور محور — مرتب جناب رفیع الدین ہاشمی

۲۔ اقبال شناسی اور جنرل ریسرچ — " " "

۳۔ اقبال شناسی اور سیارہ — مرتب جعفر بلوچ

طباعت ٹائپ سے ہے اور اچھی جلد بندی ہے۔ قیمتیں علی الترتیب، ۲۵/- روپے، ۹۰/- روپے اور ۹۰/- روپے ہیں۔

اہلِ تحقیق بھی عجب مخلوق ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آسمان پر اڑنے والا ایک پرندہ اپنی چھوٹی سی آنکھ کی صفاتِ دُور بینی و خورد بینی کے بل پر جان لیتا ہے کہ نیچے پھیلے ہوئے خوانِ زمین پر، یا کسی درخت یا پودے پر، کسی مکان کے آنگن میں یا چھت پر اس کے مقدر کا کوئی دانہ و قطرہ پڑا ہے۔ پھر وہ تیر کی طرح نشانے پر پہنچتا ہے اور اپنا رزق لے اُڑتا ہے۔ اس محقق کی نگاہ چاروں طرف دُور دُور تک دیکھ لیتی ہے کہ اس کے موضوع سے متعلق کوئی مواد کہاں موجود ہے۔ اس کی مثال یہ کتابیں پیش کرتی ہیں۔

"محور" جو پنجاب یونیورسٹی کا میگزین ہے اس میں اقبال کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے

ان کا ایک انتخاب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ماہرِ اقبالیات نے یک جا کر دیا۔ ابتدا میں "محور" کا تفصیلی تعارف درج ہے۔ آخر میں "محور میں ذخیرۂ اقبالیات" کے عنوان سے جامع فہرست شامل ہے۔

اسی طرح پنجاب یونیورسٹی ہی کا دوسرا میگزین جنرل آف ریسرچ ہے جو سال میں دوبارہ شائع ہوتا رہا ہے۔ اِس کے اہم مضامین ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب ہی نے یک جا کیے ہیں۔ آغاز میں جنرل آف ریسرچ کے متعلق نوٹ ہے۔ آخر میں فہرست اقبالیات (مندرجہ جنرل آف ریسرچ) ہے۔

جعفر بلوچ کی نظر سیارہ کی طرف گئی کہ یہ رسالہ بھی تو ۱۹۶۲ء سے اب تک ۲۔ اقبال نمبر شائع کر چکا ہے۔ عام شماروں میں بھی اقبال کے متعلق تحریریں آتی رہیں۔ جعفر بلوچ صاحب نے چند اہم مضامین کو ۲۷۰ صفحے کے اس مجموعے میں پیش کر دیا ہے۔ شروع میں تعارفِ سیارہ ہے۔ آخر میں "اشاریۂ مضامین" جو ۲۲ صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔

واضح رہے کہ کاغذی پردوں کے پیچھے اس سارے سلسلۂ تحقیق کے نگران اور روحِ رواں ڈاکٹر وحید قریشی معلوم ہوتے ہیں۔ جبھی تو اتنا بڑا کام ہو گیا۔

آزادیٔ عورت | تالیف: جناب رانا صابر نظامی۔ ناشر: ادارۂ تفہیم الاسلام۔ قذافی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۳۶۸۔ دبیز رنگین ٹائیٹل۔ قیمت: ۶۰/ روپے

رانا صابر نظامی ہمارے بڑے ذہین دوست ہیں اور مختلف موضوعات پر بے تکان لکھتے ہیں۔ ان کی اتنی کتابیں چھپ چکی ہیں کہ ان کے اونچے مقام سے دل مرعوب ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ تازہ کتاب وقت کے ایک بڑے نزاعی مسئلے پر دلچسپ مجموعۂ افکار ہے۔ بلکہ اسے عطر مجموعہ کہنا چاہیے۔ اِس کتاب میں جن لوگوں کے افکار شامل ہیں، ان میں جناب غلام احمد پرویز، سگمنڈ فرائیڈ، محمد ظفیر الدین صاحب، امیر محمد صادق صاحب، سید مودودیؒ، مولانا مودودیؒ کی کتاب کی تنقید و تنقیص کا مضمون از جناب علامہ ناصر الدین البانی صاحب، ایرانی شیعہ خاتون لیڈر جناب زہرا خانم اہلیہ

وزیر اعظم ایران حسین موسوی کا انٹرویو (۲۵ رفروری ۱۹۸۸ء کو نوائے وقت کے ایک پینل
نے لیا) - عبدالنور راغب سلفی صاحب (اسلام میں گانے بجانے کا مسئلہ) مولانا محمد یوسف
کوکن پوری، بلقیس خانم اور آخر میں جرمِ قلم کشی کا یہ گنہ گار بھی اس عظیم صف میں شامل ہے۔
بیچ میں جگہ جگہ رانا صابر نظامی صاحب کے اپنے رشحاتِ قلم وسیع پیمانے پر موجود ہیں۔ اور
اُن کی بعض باتیں قابلِ داد ہیں۔

عورت کوئی ایسا وجود نہیں جو پورے نظامِ تمدن و معاشرہ سے الگ ایک وجود ہو اور
اسے ایک مخصوص مسئلہ قرار دے کر بحثیں کی جائیں۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ سے تعلق رکھتی ہے
اور اس وجہ سے بے شمار مسائل اور بحثیں اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً آج کے
"دو تہذیبی ٹکراؤ" کے ماحول میں ہر "مسئلہ زن" پہلے سے زیادہ اُلجھ گیا ہے، کیونکہ اب اس کے
کئی کئی جواب اور ہر جواب کے ساتھ خاص نظریات موجود ہیں۔

رانا صابر نظامی صاحب اگر موجودہ تہذیبی تصادم و کشمکش میں جب کہ لادینیت اور مادہ پرستی
اپنے ایک ایک تمدنی اُصول و شعار کو ہم پر ٹھونس رہی ہے اور ہمارے اپنے اقدار و شعار
کے ٹکڑے اُڑ رہے ہیں، اپنی اور اسلام اور مسلم عورت کی حیثیت کو خوب سمجھ کر متعین کرتے اور
پھر رنگا رنگ بحثیں جمع کرنے کے بجائے ایک خاص اثباتی اور تعمیری نقطۂ نظر کی پرورش کرتے تو
وقت کا ایک بڑا فریضۂ جہاد ادا کرنے میں ان کا خاص حصہ ہوتا۔ آپ کو غور سے سمجھنا چاہیے
تھا کہ ملحدانہ مادہ پرست تہذیب نے جس طرح خدا، کائنات، انسان، معیشت، سیاست،
اخلاق وغیرہ کے متعلق اپنے نظریے دیئے ہیں۔ اسی طرح عورت کے متعلق بھی ایک جامع تصور
علمی و ادبی سطح پر بھی اور عمل کے اسٹیج پر بھی پیش کر دیا ہے اور بہ حیثیت غالب قوت کے اس
کا ساحرانہ اثر ساری دُنیا پر ڈال دیا ہے اور لوگ اپنے فلسفوں اور تمدنوں اور مذہبوں کی
تصحیح کر کے مغربی تصورات کی لائن پر آ رہے ہیں۔ اِس لادینی مادی تہذیب کے مقابلے میں
دُنیا کے دوسرے مذاہب تو کیا، خود عیسائیت نے (اپنی کمزور بنیادوں کی وجہ سے) شکست
تسلیم کر لی۔ صرف ایک خدا پرست مزاحم قوت اسلام کی تھی، سو ہماری ایک بڑی تعداد

نے اس کی مرمت شروع کر دی ہے[1]۔

اب سیدھی طرح یا اِدھر سے لڑیئے، یا اُدھر سے معرکہ آرائی کیجیے۔ باہم دِگر ٹکراتی ہوئی بحثوں اور متفرق خیالات کی آویزشوں سے کچھ نہ بنے گا۔ یہ سب باہمی اختلافی تصادمِ افکار حملہ آور قوت کی فتح کا راستہ بناتے ہیں۔ اس کام سے کون سی اصلاح و تعمیر ہوگی اور ہمیں کیا سربلندی ملے گی؟

اِس کتاب کا موضوع جیسی اچھی ترتیب، جتنی تحقیق اور جتنی متانت و سنجیدگی چاہتا تھا، افسوس کہ وہ معیار حاصل نہ ہو سکا۔ میں دو تین مثالیں بے احتیاطی و عدم سنجیدگی کی نمونتہً دیتا ہوں۔ ص ۶۹ پر ایک عنوان ہے: "جنسی میل اور مصافحہ جائز ہے"۔ یہ حکمِ خاص، حکمِ عام کی شکل اختیار کر کے نہایت غلط تاثر دیتا ہے۔ ص ۲۰۵ پر ہے کہ "نکاح کے لیے عورت اور مرد کا باہم دیدار کرنا ضروری ہے" — ص ۲۰۵ پر ہی ہے کہ "قرآن اور دیدار" لفظ دیدار کا مفہوم دوسرا ہے اور اس کے ایسے استعمال کی کوئی تشفی نظیر نہیں — ص ۲۱۰ پر لکھا ہے کہ اوکاڑہ اسٹیشن پر برقعے والی ایک عورت برقعے کی وجہ سے سیڑھی نہ دیکھ سکی اور لڑھک کر گری۔ یہ گلی کوچوں اور تھڑوں کا طرزِ استدلال ہے۔ میرے دو چشم دید واقعات سُن لیجیے: ایک عورت لاہور اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اونچی ایڑی کے جوتے کی وجہ سے بُری طرح گری۔ اسی طرح میں نے ایک اور خاتون کو اچھرہ موڑ پر دیکھا کہ وہ سکوٹر کی پچھلی نشست

---

[1] کاش آپ ان خواتین سے جذبۂ تازہ لے سکتے جنہوں نے مغربی معاشرے سے نکل کر امریکہ، جرمنی، فرانس وغیرہ میں بطور نومُسلم کے پردے کی پابندیاں اپنے اُوپر خود عاید کی ہیں (محترمہ مریم جمیلہ کی مثال یہاں موجود ہے) اور اس اعزاز یافتہ مقبول ترین پاپ سنگر سے جس نے اسلام لانے کے بعد پچھلی ساری زندگی پر خطِ نسخ کھینچ دیا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ قلم کی نوک پر نظریات کے فانوس گھما گھما کر رنگ برنگے تماشے کرنے سے زیادہ کسی بات کے اہل نہیں۔ زبانیں چل رہی ہیں، قلم چل رہے ہیں، جیسے آڈیو، وڈیو ٹیپ چل رہے ہیں، مگر چاروں طرف قبریں ہیں، جن میں کوئی زندگی نہیں ہے۔

پر بیٹھی تھیں کہ اُن کی ساڑھی پہیے میں اُلجھ گئی اور وہ گر کر سکوٹر کے ساتھ گھسٹتی چلی گئیں۔ جب کہ بدن سے ساڑھی کا زیادہ حصہ الگ ہو چکا تھا۔ اب ان چیزوں سے اُونچی ایڑی اور ساڑھی کے خلاف دلیل بازی معقول بات نہ ہوتی۔ اِسی طرح سڑک یا کارخانے یا مشینوں کے ہر ایکسیڈنٹ میں کوئی ایسی وجہ شامل ہوتی ہے جسے کوئی چاہے تو مستقل اُصولی دلیل بنا لے۔

بہرحال آپ نے جو محنت کی ہے، اس کو سامنے رکھ کر کام کا نیا نقشہ بنایئے۔

بہادروں کی کہانیاں | از جناب سید نظر زیدی (رفیق ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور۔

ناشر: ادارہ بتول، لاہور۔ کاغذ، طباعت، ٹائیٹل مناسب۔ قیمت: ۱۲/- روپے

سید نظر زیدی کے قلم کی تخلیق کردہ دنیا میں خاصا بڑا حصہ بچوں کے لیے خاص ہے۔ بہادروں کی کہانیاں بھی بچوں ہی کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اِس کتاب میں ۲۷ کہانیاں ہیں، جو مسلم طرزِ فکر سے لکھی گئی ہیں۔ اور ہر کہانی ہماری تاریخ کا کوئی ورق ہے اور ہر کردار وہیں سے لیا گیا ہے۔ یہ کہانیاں معلومات بھی دیتی ہیں، جذبات بھی پیدا کرتی ہیں اور بچوں کے لیے دلچسپی بھی اپنے اندر رکھتی ہیں۔

انصاف (اشاعت خصوصی) | زیر سرپرستی ڈاکٹر محمد یونس صاحب۔ باہتمام: روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن، اراکان برما۔ زرتعاون (شاید خاص اس ضخیم شمارہ کے لیے، پاک و ہند ۶/- روپے۔

عربی اُردو زبانوں میں ملا جلا یہ دوماہی رسالہ اراکان کی اسلامی تحریک کا ترجمان ہے۔ اور ہر شمارہ مسلمانِ برما کے مصائب کا وثیقہ ہوتا ہے۔ دُنیا کے جن چند خطوں میں مسلمان سخت تنگی میں مبتلا ہیں۔ اُن میں سے ایک برما کا علاقہ بھی ہے۔ اِس خاص نمبر میں عالم اسلام کے متعلق اور بھی بہت سے احوال درج ہیں۔ اور مفید معلومات شامل ہیں۔

المصباح | نگرانِ اعلیٰ عارف محمود - باہتمام جمعیت طلبہ عربیہ پاکستان، ۱-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور نمبر ۱۶ - قیمت فی شمارہ /۴ روپے - سالانہ /۲۵ روپے۔

اِس اشاعتِ خاص میں مولانا محمد چراغ علیہ الرحمہ کے سانحۂ رحلت پر مضمون ہے۔ تسخیرِ جلال آباد میں تاخیر کے اسباب بھی بیان کئے گئے ہیں، پھر زیادہ تر مختلف علاقوں کی سالانہ رپورٹیں ہیں جن میں کارکردگی بیان کی گئی ہے۔

تحریکِ اِسلامی سے متعلق چند باتیں | ڈاکٹر عنایت اللہ خاں اندرابی - ناظم اعلیٰ اِسلامی جمعیت طلبہ، جموں وکشمیر، سری نگر - قیمت: /۳ روپے

سفید کاغذ پر صاف کتابت وطباعت کے ساتھ یہ رسالہ مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن کی صفائی دیتے ہوئے تحریکِ اِسلامی کے لوگوں کو باندازِ دگر درسِ انقلاب دیتا ہے۔ ساری ترجمانی اس فلاسفی کی ہے جس کا سرچشمہ ایران کا قم بنا۔ ڈاکٹر کلیم صدیقی کا راگ ہم نے بارہا سُنا۔ اُن ہنگاموں کا بھی ہمیں علم ہے کہ جو ان کی مختلف کانفرنسوں میں اُٹھے۔ آپ ان کی صفائی کیا دیں گے۔ سعودی عرب پر اعتماد نہیں، لہٰذا جدوجہد ہونی چاہیے کہ صحیح اِسلامی حکومت قائم ہو۔ (وہ جدوجہد کیا ہوگی، کیسے ہوگی اور اُسے آپ امریکہ اور رُوس، اسرائیل اور عربستان کی داخلی متصادم قوتوں سے کیسے بچائیں گے) جب تک ایسا نہ ہو، متقی علماء پر مشتمل ایک عالمی کمیشن سعودی عرب میں مستقل سیکرٹریٹ قائم کرکے حج سے متعلق اُمور کی دیکھ بھال کرے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی حکومت در حکومت چلے گی کیسے؟ کوئی حکومت اپنے ملازمین اور خزانے یا اپنے اختیارات کو دوسروں کے حوالے کرکے باقی رہ ہی نہیں سکتی۔ سطحی باتیں کرنے کے بجائے اس پر ٹھوس بحث کیجیے۔ وابستگی اِسلامی جمعیت طلبہ سے؟ اور خطابات تحریکِ اسلامی سے؟ اور طرزِ بیان ایجی ٹیٹروں جیسا؟ یعنی جہاں جو ڈھانچے قائم ہیں وہاں بھی عالمی طاقتوں کے لیے اکھاڑے بنائیے اور پھر آرام سے تسبیح پڑھیے۔

(بقیہ صفحہ ۲)

ساتھ سرگرم رہتے ہیں۔ مولانا مودودیؒ کا یہ خادم خدا کی ہماری یادوں کی دُنیا میں آباد رہے گا اور آئندہ نسلیں اسے اُس کی چند مطبوعات کے ذریعے جانیں گی۔ حق تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اس نیک رُوح کو جنّت میں جگہ ملے گی۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ مزید ایک رنجدہ واقعہ سامنے آگیا۔ قیم جماعت اسلامی پاکستان، چوہدری محمد اسلم سلیمی صاحب کے بڑے بھائی بھی انہی دنوں وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے گناہوں کو نظر انداز فرمائے اور ان کی نیکیاں قبول کر کے اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے۔

واقعات متعدد تھے، رسالے میں گنجائش نہیں تھی۔ متوفیان کا صرف اجمالی تذکرہ کیا جا سکا۔ اگر آئندہ کے لیے تفصیلی حالات احباب نے لکھ دیئے تو پیش کیے جائیں گے۔ اِس وقت التماس ہے کہ قارئین سب کے لیے مغفرت کی دُعا کریں۔ اللہ سب کے لواحقین کے لیے صبر کی اور ان کے غم کے عوض عطائے خاص کی دولت ارزانی فرمائے۔ آمین۔

(بقیہ مولانا محمد چراغ کی یادیں)

اپنے مدرسے کے دروازے ہمیشہ وا کیے رکھے۔ چنانچہ اُن کے تلامذہ میں اگر ایک طرف مولانا محمد عبداللہ امیر جمعیت اہلِ حدیث پاکستان کا نام نظر آتا ہے تو دوسری جانب اثنا عشری مکتبِ فکر کے مشہور رہنما مفتی جعفر حسین مجتہد بھی مولانا کے شاگردوں میں سے ہیں ——— فقہی بُعد الطرفین رکھنے والے طلبہ کو بھی اپنے مدرسہ جامعہ عربیہ میں مہر و محبت کی فضا میں تعلیم سے آراستہ کرنا ہی بیسویں صدی میں مولانا کی سب سے بڑی کرامت ہے اختلافِ مسلک رکھنے کے باوجود تمام طلبا کو انہوں نے انتہائی شفقت و فراخ دلی کے ساتھ مئے علم و عرفان سے سیراب کیا۔ (باقی)

رمضان المبارک کے قیمتی لمحات میں تزکیۂ نفس کا بیش قیمت نادر ہدیہ

قرآن، رمضان اور محرم

از : سید اسعد گیلانی

- قرآن نے عظیم اسلامی انقلاب برپا کیا۔
- قرآن آج بھی انقلاب برپا کرنے کی قوت و توانائی رکھتا ہے۔
- قرآن مسلمانوں کا طاقتور ترین ہتھیار ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے بڑی سپر پاور بن سکتے ہیں۔
- قرآن سے خوفزدگی تمام کافر حکومتوں میں موجود ہے اور وہ اس کی قوت سے خائف ہیں۔
- رمضان تزکیہ نفس اور روحانی توانائی میں اضافے کا مہینہ ہے۔
- رمضان میں ہی کفر و اسلام کا سب سے پہلا معرکہ بدر برپا ہوا تھا جس میں روزہ دار مجاہدین نے فتح پائی تھی۔
- قرآن اور رمضان مل کر مسلمانوں کو جہاد کا راستہ دکھاتے اور کامیاب کرتے ہیں۔
- محرم آزمائشوں کا مہینہ اور مسلمانوں میں صبر و قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔
- ۳۰ کے لگ بھگ ریڈیائی تقاریر جامع اور بلیغ۔ مبلغین اسلام کیلئے عمدہ تحفہ

ضخامت : ۱۹۲ صفحات — سائز : ۲۳×۱۸/۸ — قیمت : ۲۱ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار لاہور

اگست ۱۹۸۹ء رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰